



حَامِدٌ لَكَ مُطَالَعَةٌ

مُصَنَّف

سَيِّدِ الطَّافِ عَلِيِّ بَرِيلَوِيِّ

مُقَدِّمًا

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ایم اے، پنی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ

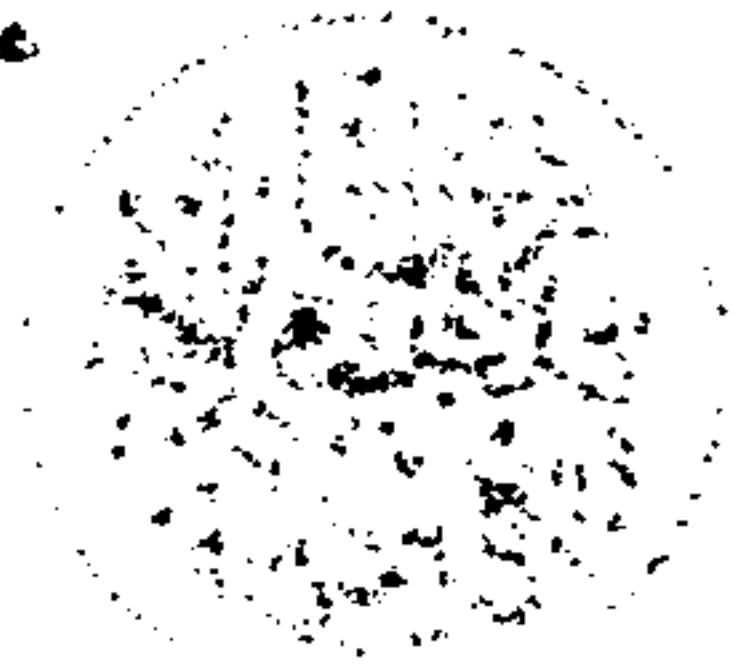
صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد

ایڈریس آف پبلیشرز: سہ کشتیاں ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ





حاصل مطالعہ



★

★ تصنیف :-

سید الطاف علی بریلوی

★

مقدمہ

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ

صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی - حیدرآباد

136949

جملہ حقوق دائمی بحق کانفرنس اکیڈمی محفوظ،

ناشر

ڈاکٹر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

سعیدہ منزل متصل سرسید گرس کالج ناظم آباد۔ بی روڈ۔ کراچی

طبع اول

تعداد ایک ہزار

قیمت Rs [REDACTED]

Accountant,

A. P. Educational Conference.

مطبوعہ

ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس، کراچی،

۱۹۶۷

انتساب

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

وز ہر چہ گفتہ اندوشنیدیم و خوانندہ ایکم

دفتر تمام گشت و بیاباں رسیدم

ماہم چناں در اول وصف تو مانندہ ایکم

پیش لفظ

(از مصنف)

مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی (نواب صدر پارٹیگ) نے اس عنوان کے تحت کہ "مقدمہ کیا ہے"؟ تحریر فرمایا ہے کہ :-

"اس دور عجیب میں جہاں مولفین اور مصنفین کی

کثرت ہے وہاں مقدمہ نگار بھی روز افزوں ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ کم تر مقدمے پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں

یا یوں سمجھئے کہ بہت کم مقدمے "مقدمے" ہوتے ہیں

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ "تقریظ" اور "مقدمہ"

میں امتیاز نہیں کیا جاتا۔ مقدمہ لیا گیا ہے۔

مقدمتہ البچیش سے جب ہم صاحب جیش

تھے تو مقدمتہ البچیش کو خوب سمجھتے تھے کہ کیا ہے؟

اب نہ جیش نہ مقدمتہ البچیش۔ روزمرہ کے مشاہدہ

سے مدد لیجئے۔ آپ جب کاروبار کے کسی ممتاز مرکز پر

گزریں گے تو دیکھیں گے کہ دوکانوں کے سامنے کا

ایک حصہ سلیقے اور دلفریب طریقے سے آراستہ سب

سے اول باصرہ نواز ہو گا۔ یہ اپنی دلفریبی سے نگاہ کو

اپنی جانب متوجہ کرے گا اور متوجہ ہونے پر جب
نگاہ تفصیل کی جو یا ہوگی تو وہ بتائے گا کہ آپ کو
جو جنس دوکان میں ملے گی وہ کیا ہے۔ بعینہ ہی حال
ایک کتاب کے "مقدمہ" کا ہے۔



جناب شیروانی صاحب کے بیان کردہ معیار مقدمہ نگاری پر بابائے
اُردو مولوی عبدالحق۔ مولانا احسن مارہروی اور زمانہ حال میں مولانا عبدالمجاہد
دریابادی اور مولانا ماہر القادری کے لکھے ہوئے مقدمے، تنقیدیں اور تبصرے
بدرجہ اتم پورے اُترتے ہیں۔ ان حضرات نے جس کتاب پر لکھا اس کے موضوع
اور مطالب پر محققانہ بحث کی۔ خوبی بھی دکھائی اور عیب بھی۔ اسی کے ساتھ
قارئین کے لئے خود اپنی رائے قائم کرنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ انکی تحریریں
صفائی بیان۔ محاورہ۔ ادب اور معلومات کا خزانہ ہیں۔

راقم نے بھی ان بزرگوں کی تقلید میں وقتاً فوقتاً کتابوں اور مقالات
پر کچھ مقدمے، دیباچے، پیش لفظ، تبصرے، اور تعارفی نوٹ، وغیرہ لکھے
اور وقتی طور پر ان کو محفوظ کر دینے کے خیال سے اپنی ادارت میں شائع ہونے
والے سہ ماہی رسالہ "مصنف" علیگڑھ اور "العلم" کراچی میں شائع کیا۔ لیکن
اخبارات اور رسالوں کی عمر کاغذ کی ناؤ جیسی ہوتی ہے جو تھوڑے عرصہ
اپنی بہار دکھا کر نہ پھانسیا ہو جاتی ہے۔

جس طرح ایک شاعر جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ

فنتشر کلام کو جمع کر کے اپنا دیوان جمع کرتا ہے بالکل اسی طرح بعض اجباب کے مسلسل اصرار پر کچھ عرصہ سے میں بھی اپنے مختلف النوع نثر پاروں کو الگ الگ موضوعات کے تحت یکجا کر کے ان کو کتابی شکل دے رہا ہوں۔ کیونکہ چبتک کتاب نہ بنے۔

”نوشتہ بماند سیاہ بر سپید“

لا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ”حیاتِ حافظ رحمت خاں“ اور ”مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد“ وغیرہ پرانی کتابوں سے قطع نظر میری حال میں شائع شدہ کتابیں ”طالب علم کی ڈائری“، ”تعلیمی مسائل“، ”پس منظر اور پیش منظر“، ”راہی و راہ نما“ اور اب یہ کتاب ”حاصل مطالعہ“ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

کہن خسروۃ خویش پیر استن
یہ از جسامت عاریت خواستن (سعدی)

مجھے اعتراف ہے کہ زیر نظر کتاب میں میرے لکھے ہوئے یہ مقدمے اور شذرات مذکورہ اساتین ادب کی نگارشاتِ عالیہ کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے لیکن پھر بھی ان کا ایک فائدہ مسلم ہے کہ وہ کتابیں اور مقالے جن پر کچھ لکھا گیا ہے کم از کم ان کا تعارف ضرور ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ کہ متفرق طور پر جو چیزیں جا بجا بکھری ہوئی ہیں ان کی یکجائی طور پر یاد تازہ ہو جائے اور اہل علم و تحقیق کو سبولی بسری مطبوعات کی از سر نو نشاں دہی ہو جائے محض اپنا کمال انشاء پر دازی دکھانا ہرگز میرا مقصد نہیں ہے۔

کتاب کا حتمی سائل کتابوں سے متعلق ہے اور حصہ دوم مقالات کے

بارہ میں ہے۔ کتابوں اور ان کے مصنفین و مؤلفین کے اسماء تو کتابوں کی فہرستوں اور کتب خانوں کے رجسٹروں میں بھی مل جاتے ہیں لیکن ایک سے ایک بلند پایہ مقالہ رسالوں میں چھپنے کے بعد جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا فراموش ہو جاتا ہے اور اگر کسی شخص کو اس کی کبھی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کا پتہ لگانا دشوار ہو جاتا ہے، اسی صورت حال کے پیش نظر بعض مؤرخ جرائد مثل "اسلامک کچر" حیدرآباد، "جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" کراچی۔ "نوائے ادب" بمبئی۔ "ثقافت" لاہور۔ "صحیفہ" لاہور۔ "قومی زبان" کراچی اور "کتابی دنیا" کراچی نے اپنے اپنے یہاں "مقالہ نما" کچھ عرصہ سے شائع کرنا شروع کئے ہیں۔ "معارف" اعظم گڑھ اور "بہان" دہلی میں بھی شائع شدہ مقالات کے "اشاریئے" سال بہ سال طبع ہوتے ہیں۔

میں نے اپنے تحریر کردہ مقالوں - دیباچوں اور تعارفی نوٹوں کا نام "حاصل مطالعہ" اس وجہ سے رکھا ہے کہ "مقدمات" کا لفظ "مقدمات عبدالحق" کے لئے مخصوص ہو چکا ہے اور اس پر دست درازی کی میں جسارت نہ کر سکتا تھا۔ مطالعہ کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اپنی زندگی میں مختلف موضوعات پر ہزار ہا کتابیں اور مضامین پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ لیکن ان سب پر لکھنے کی نہ تو توفیق ہوئی اور نہ ہی یہ ممکن تھا۔ پوری زندگی کے تمام تر فکر و مطالعہ کو قلم بند کرنا شاید کسی کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۶۲ء میں شائع شدہ آٹھ سو صفحات کے "مقدمات عبدالحق" کے "اضافہ شدہ ادیشن" میں بھی صرف ۲۵ کتابوں

پر جناب مولوی صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ دلائل و براہین کی ایک اپنی طویل حیات مبارکہ میں کم از کم چون ہزار کتابیں تو ان کے زیر مطالعہ آئی ہوں گی۔ اس حساب سے میری جانب سے پچاس کتابوں اور چھتیس مقالات پر نقد و تبصرہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونے کا مصداق ہے اور اگر میری ناچیز تحریروں کے ذریعہ ناظرین میں اصل کتابوں اور مقالات کو مطالعہ کرنے کا ذوق و شوق پیدا ہو جائے تو سمجھوں گا کہ میری حقیر کوشش بار آور ہو گئی۔

آخر میں مجھے مخدومی پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایم، اے پی، ایچ ڈی، ڈی لٹ۔ صدر شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے میری اس بے قیمت کتاب کو اپنے فاضلانہ مقدمہ سے قیمتی بنا دیا۔ موصوف اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں کے عالم اور متعدد علوم کے ماہر ہیں۔ لہذا آپ کے لکھے ہوئے کلمات تحسین میرے لئے حد درجہ ہمت افزا اور قابل فخر ہیں۔ میں اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے ارباب کار اور مرکزی وزارت معارف حکومت پاکستان کا بھی سپاس گزار ہوں کہ ان کے تعاون اور سرپرستی کی بدولت میری یہ کتاب نیز دوسری چند کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منصفہ شہود پر آسکیں۔

سید امین علی بریلوی

۱۰ اسحق منزل، کراچی

۲۳ فروری ۱۹۶۶ء

مقدمہ

از جناب پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایم۔ اے۔ پی، ایچ ڈی۔ ڈی۔ لٹ

صدر شعبہ اُردو سندھ یونیورسٹی۔ حیدرآباد

برصغیر پاک و ہند کی اسلامی تاریخ میں بیسویں صدی کا نصف اول ،
 انیسویں صدی کے نصف آخر کا بہتر مثالی قرار دیا جاسکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ
 دوران کوششوں اور کامیابیوں کی بار آوری سے متعلق ہے جو ہمارے اسلامی
 نے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ناکامی کے بعد، بدلے ہوئے حالات کے تحت
 شروع کی تھیں۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے کارہاری نشاۃ ثانیہ کے سربراہوں
 میں تھے۔ انہوں نے غیر منقسم ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن،
 معیشت و معاشرت اور ادب و علوم کے جو خا کے مرتب کئے تھے وہ تشنہ
 تکمیل رہ جاتے اگر ان میں رنگ بھرنے کے لئے بعض نہیں، بلکہ بکثرت
 مخلص حضرات بعد میں پیدا نہ ہوتے۔ اور یہ انتظام قدرت ہی کی طرف سے
 ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ملک یا قوم میں جب کوئی بڑی تحریک
 جنم لیتی ہے تو اگرچہ اس کے بانی رخصت ہو جاتے ہیں، مگر بعد میں ایسے
 اشخاص و افراد نمودار ہوتے رہتے ہیں جو اس کام کو آگے بڑھاتے ہیں۔
 سرسید نے جو قومی تحریک شروع کی تھی اس کے لئے بھی یہی ہوا اور وہ تحریک

بالواسطہ آج بھی جاری ہے اور خود پاکستان کا وجود و قیام اسی تحریک کا ثمرہ ہے۔



سید الطاف علی بریلوی صاحب بھی عملی طور پر اسی تحریک سے وابستہ ہیں۔ وہ علیگڑھ کے پروردہ بھی ہیں اور اس تحریک کے سرگرم کارکن بھی۔ ان کا کردار اس حیثیت سے بہت نمایاں ہے کہ انہوں نے سن شعور کو پہنچنے کے بعد ہی جو اس کو چپے میں قدم رکھا تو پھر اس کی روایات سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ وہ ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۰۰ء میں کی عمر سے نمایاں طور پر اس تحریک میں حصہ لیا اور آج بھی وہ جوانوں سے زیادہ ہمت و استقلال کے ساتھ اسی راہ میں گامزن ہیں۔ یہاں بریلوی صاحب موصوف کی سوانح حیات بیان کرنا میرا مقصد نہیں اور اس کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ انہوں نے علمی اور تعلیمی میدان میں قومی فلاح و بہبود کے جو ان گنت کام کئے ہیں اور جن کی ایک کمل تاریخ ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ صرف ان کی تصانیف کی تعداد سے بھی ان کی خدمات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے علاوہ ازیں، ان کے حالات اور خدمات کا ایک مختصر جائزہ عزیز گرامی جناب پروفیسر محمد ایوب قادری نے ان کی کتاب "تعلیمی مسائل" کے مقدمے میں پیش کر دیا ہے جو اپنی جگہ جامع و مانع بھی ہے۔

بریلوی صاحب کی تصانیف کی تعداد قریب ایک درجن تک پہنچتی ہے اور ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جو بار بار چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ اور

ملک کے اہل علم حضرات سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ بعض اس پائے کی بھی ہیں کہ وہ اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہیں، اسی لئے ان کے ترجمے بھی دوسری زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اُردو کے علاوہ بریلوی صاحب انگریزی تحریر میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں اور ایسی رواں دواں زبان لکھتے ہیں کہ ان کی اعلیٰ دستگاہ کا معترف ہونا پڑتا ہے۔



مجھے اس وقت بریلوی صاحب کی جس کتاب کی "تقدیم" کا فرض ادا کرنا ہے وہ بظاہر کوئی مستقل تصنیف نہیں یعنی کسی ایک موضوع سے متعلق نہیں بلکہ وہ مختلف کتابوں پر تبصروں اور تعارفی تذکروں کا مجموعہ ہے۔ تاہم اس کی اشاعت فائدے سے خالی نہیں۔ ان تحریروں کا زمانہ ۱۹۳۳ء سے شروع ہو کر اوائل ۱۹۶۵ء پر ختم ہوتا ہے۔ گویا ایک تہائی صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ تبصرے میں شامل کتابیں، اُردو، فارسی اور انگریزی زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں جو اکثر مشاہیر اہل قلم کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہیں اور اہم موضوعات کو احاطہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی افادیت اور اہمیت مسلم ہر دوسرے اہل قلم حضرات کی تصانیف پر تبصروں کے علاوہ اس مجموعے میں خود مصنف کی بعض کتابوں کے دیباچے بھی شامل کر دئے گئے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ وہ اگر دوسروں کے متعلق کُسل کر کہتے ہیں تو ساتھ ہی اپنی تحریر کے کسی پہلو کو پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتے۔

میں نے یہ مجموعہ شروع سے آخر تک جستہ جستہ پڑھا اور استفادہ

بھی کیا۔ یہ تحریریں جامع اور مختصر ہیں اور ان کے مطالعہ سے نہ صرف بہت سی کتابوں اور ان کے مصنفین کا تعارف حاصل ہو جاتا ہے بلکہ ضمناً بہت سی تاریخی، سیاسی اور ادبی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ تبصرہ نگاری کے لئے ایسی نظر بہت ضروری ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ بریلوی صاحب اس فن کے اصول و آداب سے بخوبی واقف ہیں۔ پھر ان کی تاریخی بصیرت اور وسعت مطالعہ کی جھلکیاں ہر جگہ نظر آ جاتی ہیں۔ تاریخ چونکہ ان کا خاص موضوع ہے اس لئے انہوں نے اپنی مستقل تصانیف میں اسلامی ہند کی تاریخ کے بعض ایسے پہلو بے نقاب کئے ہیں جو اب تک نگاہوں سے اوجھل تھے۔ پھر تحقیق و تدقیق سے بعض مشاہیر کی غلط رایوں کا ازالہ کر کے اصلیت اور حقیقت کو آشکار کیا ہے۔ مغرب والے اور غیر مسلم مصنفین جب مسلم مشاہیر پر قلم اٹھاتے ہیں تو اپنے تعصب اور تنگ نظری کی بناء پر ان کے حالات کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں بریلوی صاحب نے بڑی جرأت و بیباکی سے ایسے بددیانت مصنفین کی پردہ دری کی ہے اور صداقت کی تلاش میں بہت دور و در تک جانکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں اور شکر ہے کہ یہ کام جو مولانا شبلی نے شروع کیا تھا آج بھی بریلوی صاحب جیسے ذی علم اسے جاری رکھے ہوئے ہیں۔



فاضل مصنف کی زبان، اسقام سے پاک ہے۔ ان کا طرز تحریر رواں اور سگفتہ ہے۔ ان کی پختہ کاری اور کہنہ مشقی، لائقِ عداستالشیخ ہے۔ پھر ان

کی استادانہ مہارت جس طرح خود ان کی کتابوں میں نظر آتی ہے، اسی طرح اس مجموعہ میں بھی نمایاں ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون بریلوی صاحب کی اپنی کتاب "حیاتِ حافظ رحمت خاں" کا دوسرا حصہ ہے جو ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا اور آخری مضمون "انشائیے" پر تعارف ہے جو جنوری ۱۹۶۶ء میں ضبط تحریر میں آیا۔ گویا یہ مجموعہ مصنف کی زبان اور اندازِ بیان کے ارتقاء کا ایک آئینہ ہے۔ اس میں آج کی زبان اور تقریباً چالیس سال پہلے کی زبان دونوں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی زبان ایک نہج پر قائم نہیں رہ سکتی اور اس کی بدلتی ہوئی کیفیت دراصل مصنف کی پختہ کاری اور ارتقا پذیری کی دلیل ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ فاضل مصنف نے مقدمہ کو موخر کے رنگ میں پیش نہیں کیا، جیسا کہ اکثر حضرات کا معمول ہے۔ اور اس طرح قاری کو ان کے ادبی ارتقاء کے سمجھنے کا موقع دیا ہے۔

آخر میں میری دعا ہے کہ اشرفِ پاک، فاضل مصنف کو سلامت باکرامت رکھے اور ملک و قوم کو ان سے مستفیض فرمائے۔ آمین۔

غلام مصطفیٰ

فہرس

صفحہ

- ★ انتساب ۳
- ★ پیش لفظ (از مصنف) ۵
- ★ مقدمہ ۱۱
- پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں
ایم، اے۔ پی، ایچ ڈی۔ ڈی۔ لیٹ

★ ★ ★ ★ ★

حصہ اول - کتابیں

صفحہ	سنہ	نام کتاب	نمبر شمار
۲۳	۱۹۳۳ء	حیاتِ حافظِ رحمت خاں (میا چہا اول)	۴
۳۲	۱۹۳۹ء	رباعیاتِ عرشِ فاروقی	۵
۳۹	۱۹۴۲ء	محمود گادواں	۶
۴۱	۱۹۴۲ء	قدیم ہندوستان	۷
۴۲	۱۹۴۲ء	یادگارِ نقیر	۸
۴۷	۱۹۴۲ء	نشریات	۹
۴۸	۱۹۴۲ء	لغشِ فرنگ	۱۰

۳۹	۱۹۴۲ء	تمدنِ اسلام کا پیام — بیسویں صدی کی دنیا کے نام	۱۱
۵۰	۱۹۴۲ء	ذکر الجیب	۱۲
۵۲	۱۹۴۳ء	ہمارے ہندوستانی مسلمان	۱۳
۵۴	۱۹۴۵ء	مختب سعید	۱۴
۵۷	۱۹۴۹ء	بوستانِ حسرت شیروانی	۱۵
۶۷	۱۹۵۱ء	مستقبلِ اسلام	۱۶
۷۶	۱۹۵۲ء	شہر کے تاریخی ناول	۱۷
۸۲	۱۹۵۲ء	تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت	۱۸
۸۶	۱۹۵۵ء	علیگندہ میگزین (علیگندہ نمبر)	۱۹
۹۳	۱۹۵۷ء	رہبرِ نسواں	۲۰
۹۷	۱۹۵۸ء	ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں	۲۱
۱۰۲	۱۹۵۹ء	جمہوریت اور تعلیم (جلد اول و دوم)	۲۲
۱۱۱	۱۹۵۹ء	تاریخ تحریک آزادی	۲۳
۱۲۱	۱۹۵۸ء	مناہبِ عالم	۲۴
۱۲۲	۱۹۵۸ء	ارتقاءئے انسانی	۲۵
۱۲۸	۱۹۵۸ء	پراسرار کائنات	۲۶
۱۳۰	۱۹۵۸ء	مشاہیر کے تعلیمی نظریے	۲۷
۱۳۶	۱۹۵۹ء	مقدرِ انسانی	۲۸
۱۳۸	۱۹۶۰ء	علم و عمل — وقائع عبدالقادر خانی (الف)	۲۹

۱۳۱	۱۹۶۰ء	علم و عمل — وقائع عبدالقادر خانی (ب)	۳۰
۱۳۳	۱۹۶۱ء	اُردو زبان اور اسالیب	۳۱
۱۳۸	۱۹۶۱ء	ذکر و فکر	۳۲
۱۵۰	۱۹۶۱ء	حکیم عمر خیام	۳۳
۱۵۷	۱۹۶۱ء	شیخ عبدالقدوس گنگوہی	۳۴
۱۶۲	۱۹۶۲ء	مسلمانوں کا نظام تعلیم (طبع ثانی)	۳۵
۱۶۷	۱۹۶۲ء	مخدوم جہانیاں جہاں گشت	۳۶
۱۶۹	۱۹۶۳ء	گمشدہ بے خار	۳۷
۱۷۵	۱۹۶۳ء	علمائے سلف و نابینا علماء	۳۸
۱۷۹	۱۹۶۳ء	حیاتِ حافظ رحمت خاں (طبع ثانی)	۳۹
۱۹۶	۱۹۶۳ء	عظیم علمائے نفسیات	۴۰
۲۰۲	۱۹۶۳ء	ماہی و راہ نما	۴۱
۲۰۷	۱۹۶۳ء	عہدہ نگار کی سیاسی، علمی و ثقافتی تاریخ	۴۲
۲۱۳	۱۹۶۳ء	آپ بیتی — قاضی لطافت حسین دل ہاشمی بدایونی	۴۳
۲۱۸	۱۹۶۳ء	پاکستان کی کلچر	۴۴
۲۲۵	۱۹۶۳ء	سر سید کا علمی کارنامہ	۴۵
۲۲۸	۱۹۶۵ء	تجزیہ کلام غالب	۴۶
۲۳۳	۱۹۶۵ء	روزگار فقیر (جلد اول و دوم)	۴۷
۲۳۸	۱۹۶۵ء	اقبال کے تعلیمی نظریات	۴۸

۲۴۱ ۱۹۶۶ افوار الصفا ۴۹

۲۴۲ ۱۹۶۶ انشائیے ۵۰

* * * * *

حصہ دوم کے مقالات

* * * * *

۲۵۵ ۱۹۶۶ سرگزشت محمد علی خاں عرف حمی گرین ۱

۲۵۵ ۱۹۶۳ سرراس مسعود ۲

۲۵۶ ۱۹۵۱ خطوط - بنام ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۳

۲۶۰ ۱۹۵۱ ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا؟ آثار اکبر آباد ۴

۲۶۱ ۱۹۵۱ وادی نیل سے وادی نجد تک! ۵

۲۶۳ ۱۹۵۱ خواجہ غلام فہیدہ کی شاعری ۶

۲۶۳ ۱۹۵۲ اسلام کا معاشی نظام ۷

۲۶۵ ۱۹۵۲ تعلیم انسانی ۸

۲۶۶ ۱۹۵۲ شمس العلماء مولانا حالی ۹

۲۶۷ ۱۹۵۳ ۱۸۱۵ء کا ایک سفر بنگال ۱۰

۲۶۹ ۱۹۵۳ ہماری تعلیم اور اس کی روح ۱۱

۲۷۰ ۱۹۵۳ تنقید حیات جاوید ۱۲

۲۷۲ ۱۹۵۳ ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا؟ اور سلیکشن کی تاریخی عمارت ۱۳

۲۷۳ ۱۹۵۲ عہد اسلامی میں علمی اور تہذیبی ترقی ۱۴

۲۷۵ ۱۹۵۲ انسان کی کہانی ۱۵

۲۷۵ ۱۹۵۲ مسلمانوں کی تعلیم قرون وسطیٰ میں ۱۶

۲۷۶	۱۹۵۳ء	غم ترک وطن	۱۷
۲۷۹	۱۹۵۵ء	برصغیر پاک و ہند میں آلات حرب کی ایجاد و ترقی	۱۸
۲۸۰	۱۹۵۶ء	مارخیم (ایک گنھگار کے نفسیات کا مطالعہ)	۱۹
۲۸۱	۱۹۵۶ء	اسلام زبان ندارد	۲۰
۲۸۴	۱۹۵۷ء	مولانا مفتی حافظ بخش بدایونی	۲۱
۲۸۵	۱۹۵۷ء	مولانا سید مناظر احسن گیلانی — نقوش و تاثرات	۲۲
۲۸۶	۱۹۵۷ء	ابوالطیب متنبی	۲۳
۲۸۷	۱۹۵۷ء	مقدد انسانی	۲۴
۲۸۸	۱۹۵۷ء	متنبی کی زندگی کا ایک پہلو	۲۵
۲۸۸	۱۹۶۰ء	مقدمہ — ۱۹۵۷ء کا تاریخی روزنامہ	۲۶
۲۸۹	۱۹۶۳ء	یادش بخیر!	۲۷
۲۹۳	۱۹۶۴ء	مولانا سید طفیل احمد منگھوری (علیگ)	۲۸
۲۹۴	۱۹۶۳ء	علیگڑھ میں میرے ۴۴ سال	۲۹
۲۹۵	۱۹۶۵ء	پاکستان کا محفوظ خزانہ — "بلوچستان"	۳۰
۲۹۷	۱۹۶۴ء	کچھ "اعلم" کی بابت	۳۱
۳۰۱	۱۹۶۵ء	میرے جیل کے دو سال	۳۲
۳۰۲	۱۹۶۳ء	بیگ شاہ — میرے آبا	۳۳
۳۰۳	۱۹۶۵ء	بقیات ذاب وقار الملک	۳۴
۳۰۶	۱۹۶۶ء	مولانا سید محمد سورتی مرحوم	۳۵
۳۰۶	۱۹۶۶ء	سرشاہ سلیمان اور ادب اردو	۳۶

136949

”حیاتِ حافظِ رحمتِ خاں“

(دیکھا چکر طبعِ اول)

مصلحت جو مورخین نے ہمارے ملک کی صحیح تاریخ پر تاریکی کا پردہ ڈال کر جیسی جیسی سیاسی اُستادیاں کی ہیں ان کا غیر جانبدار تعلیم یافتہ طبقہ کو احساس پیدا ہو چلا ہے اور اب کوئی دن خالی نہیں جاتا کہ بطور ردِ عمل تاریخ ہند کی اصلی تصویر بروئے کار لانے کے لئے دو مند اور حساس اہل قلم کا کوئی نہ کوئی کامیاب نتیجہ ہمارے مشاہدہ میں نہ آجاتا ہو۔

علامہ شبلی۔ لالہ لاجپت رائے۔ میجر بی ڈی باسو۔ پروفیسر جاوونا سٹھ۔ سرکار اور مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اس اہم کام کی ابتدا کی اور ملک کے بکثرت دوسرے اہل قلم اس مفید کام کو جاری رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں حیاتِ حافظِ رحمتِ خاں بھی اسی قسم کی کوششوں میں سے ایک ناچیز کوشش ہے۔ حافظِ رحمتِ خاں کی شخصیت ہمیشہ سے محمود غزنوی، محمد تغلق، اورنگ زیب، میر قاسم، ٹیپو سلطان اور امیر خاں کی طرح مورخین کے تعصب کا شکار رہی ہے اور اسی وجہ سے دنیا ان کی اصلی شخصیت کو جاننے سے قاصر رہی کیونکہ صرف یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اٹھارویں صدی کے ایک مشہور فاضل،

خائن، ظالم اور متعصب حکمران تھے۔ مروجہ تاریخوں کا سواد اعظم ان کے خلاف اس قسم کے الزامات سے بھرا پڑا ہے اور چونکہ ایک سردار قوم کی زندگی کا بیان دراصل اس کی قوم کے حالات کی تفسیر ہوا کرتا ہے اس لئے جس قدر حافظ رحمت خاں بدنام ہوئے اسی اعتبار سے ان کی قوم ذلیل ہوئی اور آج روہیلہ قوم کا بھی اس کے علاوہ اور کوئی طغرائے امتیاز نہیں ہے کہ وہ ظالموں اور لیٹیروں کی جماعت تھی اور ہیں!

ظالم لیٹیروں کی جماعت اور اس کے غاصب اور خائن، سردار کا وجود کیا کسی نوع سے پسندیدہ بھی ہو سکتا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو تو شجاع الدولہ والی اودھ اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیا گناہ کیا جو باہمی اتحاد عمل سے ایک قابل نفرت جماعت اور اس کے سردار کا استیصال کر دیا، گناہ تو گناہ یہ تو بہت بڑے ثواب کا کام کیا جس کیلئے اس سرزمین کے رہنے بسنے والوں کو ہمیشہ احسان مند ہونا چاہیے۔

حقیقتاً یہی وہ نظریہ ہے جس کو تقویت دینے کے لئے کتابیں لکھی گئیں، اور لکھوائی گئیں تاکہ سند رہیں۔

مشہور و معروف تاریخ سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین ایک جنگ اتفاقیہ اپنی تاریخ جلد دوم میں جنگ پٹنہ کے ذیل میں اپنی آپ بیتی اس طرح لکھتے ہیں :-

”ڈاکٹر فلرٹن اور میرے درمیان کچھ خط و کتابت بھی رہی تھی..... اس نے مجھے صلاح دی تھی کہ مجھ کو

اپنے اور بادشاہ (شاہ عالم) کے بہت جلد انگریزی کہیں
 میں پہنچنے کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس خبر سے میں نے اپنے
 والد کو مطلع کیا اور ایک ایسے معاملہ میں جس سے ہمارے
 خاندان کا استحکام ہو اور انگریز قوم کے شکریہ کا مورد
 ہو سکے پیشقدمی کرنے پر اصرار کیا.....“

یہی غلام حسین تھے جنہوں نے سیر المتاخرین کے نام سے ایک ضخیم تاریخ لکھ
 ڈالی۔ ظاہر ہے کہ ان کی تالیف کی بنیاد بھی اسی ذہنیت پر رکھی گئی جس کا جلوہ ان
 کے مندرجہ بالا بیان میں نظر آتا ہے، مگر پھر بھی ان کی کتاب ہمارے ”ہمدرد مورخین“
 ایک ایسی سند ہے جس کے غلط ثابت کرنے سے ہمیں قاصر سمجھا جاتا ہے۔

ایک اور کتاب دتار منخ فیض بخش ہے اس کے مصنف شیو پرشاد
 روہیل کھنڈ کے سب سے بڑے مورخ مسٹر ہملٹن کے روہیلانڈ، پٹنہ، یاروہیل
 ہسٹورین ہیں۔ انہوں نے بقول سر جان اسٹریچی تاریخ روہیل کھنڈ کے متعلق
 سب سے زیادہ قیمتی معلومات، اپنی بیش بہا کتاب سے بہم پہنچائی ہیں۔ اب
 اس کتاب کی شان نزول ملاحظہ ہو کہ مصنف نے اس کو مسٹر کرک پیٹرک،
 ایک سویلین کی تحریک پر لکھ کر نواب فیض اللہ خاں والی رامپور سے اصلاح لی
 تھی اور اس کے مسودہ کو ایک ذمہ دار مگر خفیہ کام پر تعینات، افغان نے
 مسٹر ہملٹن کے حوالہ کیا تھا، جس کا ترجمہ کر کے مسٹر ہملٹن نے ایک ایسی کتاب لکھی
 جو یادگار ہے اور کسی مورخ نے روہیلوں کے حال پر اس وقت تک قلم نہ
 اٹھایا جب تک مسٹر ہملٹن کی کتاب کو اپنے سامنے نہ رکھ لیا۔ حتیٰ کہ انسائیکلو پیڈیا

بری ٹینک میں بھی جو روہیلوں اور روہیل کھنڈ کے متعلق بیان درج ہے وہ مسٹر ہملٹن ہی کی کتاب کے حوالہ سے ہے اور مسٹر ہملٹن کی کتاب کو یہ اہمیت محض اس وجہ سے حاصل ہے کہ اس کی بنیاد ایک نیٹو ہسٹورین کی تاریخ پر ہے جو عام اس سے کہ کیسے ہی اثرات کے تحت کیوں نہ معرض وجود میں آئی ہو، غلط نہیں ہو سکتی اور ہمیں اس کو جھٹلانے کا حق نہیں پہنچتا۔

اسی طرح مزار فیح سودا ملازم نواب شجاع الدولہ کا مشہور قصیدہ، حافظ نے سر دیانہ دیانہ... اور نواب سعادت علی خاں کے ایک وظیفہ خوار کی کتاب "عماد السعادت" گو اور وہ روہیل کھنڈ کی مشہور رقابت کا نتیجہ ہیں اور ان کی ایسے لوگوں کی نظر میں جنہ داری کی عینک اتار کر صحیح واقعات کی چھان بین کر نیلے دعویٰ دار ہیں کوئی وقعت نہ ہونی چاہیے تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کو بھی کافی تاریخی اہمیت دی گئی ہے اور واقعات کے مسخ کرنے میں ان سے کافی مدد لی گئی ہے۔

زمانہ حال کی مشہور کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور سر جان اسٹریچی سابق لفٹیننٹ گورنریو، پی کی مؤلفہ کتاب ہیسٹنگز اینڈ دی روہیلا وار، ہے اس کتاب کو دو وجہ سے اہمیت دی جاتی ہے کہ اول تو مصنف کی شخصیت بہت بلند و مستند ہے دوسرے اس کو لندن میں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کے تمام علمی خزانوں پر پوری پوری دسترس حاصل تھی اس لئے اس کو گورنر جنرل ہیسٹنگز کے زمانہ حکومت کے اصلی سرکاری کاغذات اور تمام اہم بیانات و تحریرات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ اس کتاب کی

مذکورہ بالا خصوصیات کا ہمیں بھی اعتراف ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گورنر جنرل ہیٹنگز کے زمانہ حکومت کی روہیلوں سے متعلق تمام ضروری تحریریں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں بھی محفوظ موجود نہیں ہیں، چنانچہ ان تحریروں کے بارے میں ممبران کلمکتہ کونسل میسرز مانس، کلیورنگ اور فرانسس نے اپنے ایک خط بنام کورٹ آف ڈائریکٹرس لندن میں ۳۰ نومبر ۱۹۷۷ء کو جنگ روہیلہ کے مظالم کی بابت لکھا کہ :-

..... مظالم کی یہ تفصیلات غالباً کبھی آپ کے علم میں نہ آئیں اگر ہم مسٹر ہیٹنگز سے کرنل چیمپین اور مسٹر مڈلٹن ریڈینٹ کی خط و کتابت کے کاغذات طلب نہ کر لیتے پھر بھی اس خط و کتابت کے وہ کاغذات ہمارے سامنے رکھے گئے ہیں جن کا تسلسل شکستہ ہے اور جو نامکمل حالت میں ہیں نیز بکثرت خطوط، دانستہ چھپائے گئے ہیں اور ہمیں یہ نتیجہ نکالنے میں کچھ پس و پیش نہیں ہے کہ ان سے بھی زیادہ ظالمانہ حالات و واقعات دبا دئے گئے ہیں.....“

اس تحریر کی روشنی میں سر جان اسٹریچی کی کتاب کی وقعت خود بخود کم ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی وہ ہمارے شکر یہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب میں بہت سا ایسا مواد جمع کر دیا ہے جس سے روہیلوں کے متعلق آزاد

رائے قائم کرنے والے کو بھی کچھ نہ کچھ مدد مل جاتی ہے۔

سرجان اسٹریچی، ہملٹن اور ان کے ہم خیال مورخین کی تالیفات کو چھوڑ کر جب ہم دوسری طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کے ملک اور قوم میں ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوئیں جنہوں نے انصاف پسندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس گروہ میں ایڈمنڈ برک، کرنل چیمپین، نثر پڈان، فاکس، فرانسس، لارڈ میکالے اور میل کے نام لئے جاسکتے ہیں جنہوں نے خود دار، مرفروش اور مہذب و ترقی یافتہ روہیلہ قوم کے افسوسناک استیصال اور ان کے ذی علم، ذی حوصلہ، الوالعزم، وفا شعار اور ایثار پیشہ سردار حافظ رحمت خاں کے حسرتناک قتل کے صحیح اور سچے واقعات سے دنیا کو روشناس کرنے میں پوری پوری وسعت نظر، فراخ دلی اور دیانتداری سے کام لیا۔ مصالحہ ملکی و قومی اور تعصبات نسبی و مذہبی کو بالائے طاق رکھ کر ظالموں کے ظلم کی سخت مذمت کی اور مظلوموں کی حمایت میں کمال درجہ اخلاقی جرأت سے کام لیا۔

ان خداترس مشاہیر کی تقریریں، تحریریں، بیانات اور ان میں سے بعض کی تصنیف کردہ گرانقدر کتابیں روہیلوں اور ان کے سردار حافظ رحمت خاں کے صحیح حالات لکھنے والے کی رہنمائی کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہیں۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں اپنی اس تالیف میں ان قابل مصنفین کی تصنیفات سے بہت کچھ مدد ملی ہے۔ روہیلائے اعظم کی اس سوانح عمری کی تدوین میں ہمیں ان کے علاوہ اور بہت سی تاریخوں کی ورق گردانی کرنی پڑی ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ بہترین و مستند تاریخ روہیل کھنڈ کی سرمایہ دار کتابیں

گلستانِ رحمت، گلِ رحمت اور تاریخِ سلیمانی خاص طور پر ہمارے پیش نظر رہی ہیں۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، ان کتابوں سے مورخین نے بالکل کام نہیں لیا یا بہت کم کام لیا ہے جس کی وجہ ان لوگوں نے یہ بتائی ہے کہ چونکہ یہ کتابیں ان مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جنکو حافظِ رحمت خاں سے نسبی تعلق ہے اس لئے انہوں نے یہ کہہ کر ان کو ہمیشہ نظر انداز کیا کہ ایک بیٹا اپنے باپ کے حالات لکھنے میں ضرور رنگ آمیزی سے کام لے گا۔ اسی اصول کو مد نظر رکھ کر ان لوگوں نے سیر المتاخرین اور فیض بخش جیسی کتابوں کو مستند مانا، حالانکہ ان کتابوں کے مصنفین کو جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ثابت کیا ہے بے لوث اور آزادانہ مورخ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس خیال سے کہ ہم حافظِ رحمت خاں کی زندگی کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کو اپنے ناظرین کے سامنے رکھ سکیں ہم نے یہ ضروری سمجھا کہ ہم ہملٹن اور اسٹریچی کے جمع کئے ہوئے مواد سے فائدہ اٹھائیں یا مولانا نجم الغنی خاں رامپوری کی کتاب اخبار العنادید کے (جس کے غلط واقعات کی ہمیں جا بجا تردید کرنی پڑی ہے) ورق لوٹیں ہم نے گلستانِ رحمت اور گلِ رحمت سے اصل واقعات اور حالات کا پتہ لگایا ہے اور ان بیان کردہ روایات کو درایت کی کسوٹی پر پرکھا ہے تاظرین اس کتاب کو تمام وکمال مطالعہ کرنے کے بعد خود اس فیصلہ پر پہنچیں گے کہ ہم اس فرض سے جو ایک سوانح نگار کا ہو سکتا ہے کس حد تک عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

ایک سوانح نگار کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے ہیرو کی بُرائیوں پر پردہ ڈال کر محض اس کی اچھائیوں کو نمایاں نہ کرے اور اپنے ہیرو کی حیثیت بڑھانے

کے لئے اس کے معاصرین کو نیچا دکھانے کی کوشش نہ کرے اس لئے ہم نے حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی نہ تو سیاسی غلطیوں پر پردہ ڈالا ہے اور نہ ان کی شخصیت کو چمکانے کے لئے نواب علی محمد خاں یا اس عہد کے دوسرے آدمیوں کی شخصیتوں کا استخفاف کیا ہے۔

حق پڑو ہی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سلامت روی اس تالیف کا جوہر ہے۔ اچھے یا بُرے واقعات کو کچھ اس طور سے ترتیب دیدیا ہے کہ ان کی اصل تصویر ناظرین کے سامنے پیش ہو جائے اور وہ خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہمارے صاحب تذکرہ کے متعلق رائے قائم کر لیں، عبارت آرائی کے ذریعہ اپنی طرف سے ہم نے لوگوں کی طبائع پر کوئی غیر ضروری اثر انداز نہیں کی ہے۔ ہمارا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے ہیر و کا قلب نکال کر دنیا کو اس کی اصلی حالت مشاہدہ کرا دیں۔ اس قلب کے محسوسات و واردات کو کچھ ہم نے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور کچھ ناظرین سمجھیں۔ تنہا اس فرض کی ادائیگی ہم سے ممکن نہیں، کیونکہ بقول مؤلف سیرت محمد علی، "انسان کی زندگی کائنات کا سب سے پوشیدہ راز ہے اور انسانی شخصیت کو سمجھنا اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا اسی نسبت سے دشوار

صاحب تذکرہ کے حالات کے سوا عہد قدیم بمعنی زمانہ مہا سبھارت سے لیکر عہد حاضرہ تک سرزمین روہیل کھنڈ کے اہم تاریخی واقعات، مشاہیر روہیل کھنڈ کے حالات اور خصوصیت کے ساتھ حافظ الملک کی ازواج و اولاد کا تذکرہ مع ان کے سلسلہ ہائے نسل اور بیان معافیات خاندانی

بھی ان اوراق میں شامل ہے ان بیانات و حالات کے لئے حواشی اور میوں کا مطالعہ ضروری ہے جو بجائے خود ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ چند صفحات جن کو ہم حاصل کتاب سمجھتے ہیں ہندوؤں کے لئے بھی مخصوص کر دئے گئے ہیں جن سے حافظ رحمت خاں کے عہد حکومت میں ہندو مسلمانوں کے خوشگوار اور مخلصانہ تعلقات یگانگت پر کافی روشنی پڑتی ہے، ان صفحات کے مطالعہ سے اُمید ہے کہ ہندو قوم کی موجودہ فرقہ وارانہ ذہنیت کے تبدیل ہونے میں بہت کچھ امداد ملے گی۔

ہمیں اس امر کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس تالیف کے لئے فارسی، اردو اور انگریزی کی ان قلمی و مطبوعہ کتابوں میں جن کی اجمالی فہرست آخر میں دی گئی ہے اور ان کے علاوہ بکثرت بوسیدہ قلمی نوشتہ جات کی فراہمی اور ان سے حوالے تلاش کرنے نیز اقتباسات لینے میں ہمیں کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جو لوگ تصنیف و تالیف کا شغل رکھتے ہیں وہ اس امر سے واقف ہیں کہ ایک تاریخی تالیف کو مرتب کرنے کا کام جس میں مختلف کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑے بہ نسبت ایک طبع زاد تصنیف کے کس قدر مشکل ہے۔

بہر حال توفیق الہی اور بزرگوں اور احباب کی امداد سے تالیف کتاب کا یہ مشکل کام انجام کو پہنچ گیا، اللہ حسن نیت کو دیکھے والا ہے، دعا ہے کہ اس ناچیز کوشش کو قبول عام نصیب ہو، اور ملک و ملت کو اس سے بیش از بیش فائدہ پہنچے! آمین۔

رباعیات عرش فاروقی

(تعارف)

منشی اعتماد الدین احمد عرش فاروقی حکیم مفتی عماد الحسن صاحب مجرب بریلوی مرحوم کے شاگرد اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کے پیرو تھے۔ بریلی محلہ ترولان کے رہنے والے تھے، اپنے والد منشی فرید الدین احمد کے سلسلہ سے فاروقی اور والدہ کی جانب عالی نسب سید تھے۔ چونکہ عرش کے والد ان کے بچپن ہی میں مفقود الخیر ہو گئے تھے اور مرحوم نے اپنی نانی کے زیر سایہ پرورش پائی اس لئے ان کو نانہال کے خاندان پر ہی زیادہ فخر تھا اور دراصل یہ خاندان تھا بھی قابل فخر۔ کیونکہ ایک طرف ان کے جد اعلیٰ میر مشیت علی اور ان کے صاحبزادے میر مست علی شہزور سپاہی تھے تو ان کے نانا مولوی محمد علی اور پرانا مولوی عنایت علی مصنف "مرقع فیض" (لال خانیوں کی تاریخ) بلند پایہ عالم تھے۔

مولوی عنایت علی کے ہر سہ بھائی عاقب احمد علی، مولوی ولایت علی اور مولوی ہدایت علی بریلی میں اپنے زمانہ کے مشہور ارباب فضل و کمال سے تھے۔ بالخصوص مولوی ہدایت علی آسمان علم کے درخشندہ ستارے

تھے۔ جید عالم دین ہونے کے علاوہ منطق و فلسفہ میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے مولوی فضل حق خیر آبادی کے شاگرد و رشید اور ریاست رامپور کے مدرسہ عالیہ کے نامور استاد تھے۔ نواب کلب علی خاں مرحوم ان کے بڑے قدر دان تھے لیکن جنرل عظیم الدین خاں مدارالمہام کے عہد اقتدار میں جنرل صاحب سے ناراض ہو کر ملازمت ترک کر دی تھی۔

اس ناراضگی کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز جنرل عظیم الدین خاں نے مولوی صاحب کے مدرسہ کا امتحان لینا چاہا مولوی صاحب کو یہ بات سخت ناگوار گذری۔ فرمایا کہ ”جس جگہ بے علم لوگ اہل علم کا امتحان لینے لگیں اس جگہ میں نہیں رہ سکتا، اور ملازمت چھوڑ دی۔“

اعتماد الدین احمد ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو عین عالم جوانی میں ۲۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس ۲۴ سالہ زندگی کے حالات نہایت مختصر مگر ساتھ ہی حد درجہ درد انگیز ہیں۔ جب یہ دو سال کے اور ان کی بہن ۳ سال کی تھیں تو اس زمانہ میں ان کے والد منشی فرید الدین احمد مع متعلقین لکھنؤ میں مقیم تھے۔ وہ عرصے سے تلاش معاش میں سرگردان تھے۔ اسی سرگردانی کے عالم میں ایک روز کہیں غائب ہو گئے۔ خدا جانے کہاں گئے اور کیا حادثہ پیش آیا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ خاندانی مال دولت صرف کر دینے کے بعد ترک دنیا کا ارادہ تھا ممکن ہو کہ فقیری لے لی ہو۔ اور آج تک کہیں زندہ ہوں۔ بہر حال اس واقعہ کے بعد عرش کی نانی اور والدہ وغیرہ بریلی والیں تشریف لے آئیں اور ان حرمان نصیب سیدانوں کی

زندگی کا بقیہ زمانہ جس طرح گزرا وہ ہمارے ملک کے غریب و نادار طبقہ کی
خوں چکاں داستان کا ایک دل ہلا دینے والا باب ہے۔

ایک دوکان کے جزوی کرایہ کی قلیل آمدنی سے ایک تنگ و تاریک
بوسیدہ مکان میں گذر بسر کی اور جس طرح بن پڑا کمال خودداری، عزت
نفس اور غیرت خاندانی کا لحاظ و پاس رکھتے ہوئے عرش اور ان کی بہن کی
تعلیم و تربیت کی۔ ہمشیرہ جوان ہوئیں اور ان کی شادی ہوئی۔ خود عرش
نے مولوی محمد مستقیم صاحب کے مکتب واقع محلہ عقب کو توالی میں قرآن شریف
اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد بریلی کے تحصیل اسکول سے اردو مد
پاس کیا۔ انگریزی کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی استطاعت نہ تھی اس لئے
باقاعدہ تعلیم اس سے زیادہ نہ ہو سکی۔ لیکن طلب علم کی تشنہ کامی ہو رہی تھی
اور فطرتاً پڑھنے لکھنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کا حد درجہ ولولہ اور
جوش تھا اس لئے مذہبی، تاریخی، اور ادبی لٹریچر کا اس قدر مطالعہ کیا کہ
بلا مبالغہ تازلیست کتابوں کا کپڑا بنے رہے۔ مضمون نگاری اور شعر و سخن
سے فطری مناسبت اور قدرتی ذوق تھا۔ علاوہ بریں قدرت نے بہترین
حافظ اور قابل رشک ذہانت بھی عطا کی تھی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا
کہ بریلی اور بریلی سے باہر کے تمام ایسے ارباب کمال جنکو عرش سے ملنے کا
اتفاق ہوا متفقہ طور پر ان کو ایک ”جوہر قابل“ تسلیم کرتے تھے۔ مولوی
عبدالودود صاحب درو سہسوانی مرحوم جو ماضی قریب میں بریلی اور درو سہسوانی
کے مشاہیر میں سے گذرے ہیں عرش کی ذہانت و قابلیت کا لوہا مانتے تھے۔

اور مولوی سلیم پانی پتی مرحوم بھی فرمایا کرتے تھے کہ ”خدا اس لڑکے کی عمر دراز کرے یہ اُفقِ عالم پر آفتاب بن کر چمکے گا“ کاش مولوی صاحب مرحوم کی یہ دعا قبول ہوتی۔

عرشِ مرحوم کو بایں ہمہ حصولِ قابلیت اور باوجود سخت تلاش و جستجو کوئی معقول ملازمت دستیاب نہ ہو سکی۔ اضلاعِ روہیلکھنڈ کے علاوہ دہرہ دون کاپور، لکھنؤ اور کلکتہ تک تلاشِ معاش کے لئے تگ و دو کی۔ ایک ذاتی ماہوار رسالہ گلگدہ اور ایک ہفتہ وار اخبار نکالا لیکن سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی نہ چلے۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے ”روزانہ اخبار“ اور ”روہیلکھنڈ گزٹ“ بریلی کی سب اڈیٹری اور مینسپل بورڈ میں نہایت ادنیٰ درجہ کی محرمی اور مدرسہ کے فرائض اہلہ انجام دیئے لیکن ”انٹرنس پاس“ نہ ہونے کی وجہ سے کسی جگہ پندرہ بیس روپے ماہوار کے بھی مستقل ”نوکر“ نہ ہو سکے اور بے زری و بے روزگاری کی جان کاہ مصیبت و تباہ کاری نے اس خودواہ و حساس نوجوان کو قبل از وقت فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک طرف حوصلہ مند نوجوان کی یہ اُمنگ کہ ”میں آگے بڑھوں“ دوسری طرف سدرہ زمانہ کی یہ فند کہ ”آگے بڑھنا ناممکن ہے“ اسی کش مکش میں اس مصیبت زدہ و ناکام انسان کی کشتی حیات ٹکرائی اور ریاضے فنا میں غرق ہو گئی۔

معمولی نزلہ زکام سے تپ و قہقہہ تک نوبت پہنچی جو ریشی مرض ٹھہرا۔۔۔۔۔ ایک غریب و مفلوک الحال شخص اس سے کس طرح جاں برہو۔۔۔۔۔ نہ باقاعدہ علاج ہوا اور نہ مناسب غذا مل سکی۔ ہوا دار اور صحت

۳۴
مکان کا تو ذکر ہی کیا، غرض ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو رات کی بھیانک تاریکی میں ایک غم نصیب بیوہ کی عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔

غنیمت ہے کہ عرش کی نانی کا جن کو ان سے دیوانہ وار عشق تھا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ماں کی قسمت میں البتہ یہ غم لکھا تھا۔ یہی ایک غم نہیں..... بلکہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عرش کے بہنوئی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اللہ اللہ عرش کی والدہ کی بھی کیا زندگی تھی۔ خاوند کی جدائی، شفیق ماں کی مفارقت، جوان بیٹے اور داماد کی موت، مفلسی، ناداری اور ساتھ کے ساتھ طرح طرح کے سخت امراض میں خود مبتلا ہونے کے باوجود دق و سل کی شکار بیوہ لڑکی اور اس کے چار یتیم و معصوم بچوں کا ترسول اور پھر ان بچوں میں سے بھی ایک نہایت عزیز لڑکے کی موت۔ آخر کب تک.....

۲۱ اگست ۱۹۳۲ء کو یہ مجبور و ناچار تھکی ماندی مسافرہ بھی بالآخر اپنی آخری منزل سفر پر پہنچ گئی۔ بیس روز بعد، ۲۱ اگست ۱۹۳۲ء کو عرش کی بہن کا بھی انتقال ہو گیا۔

اب اس گھر کی باقی ماندہ نشانیاں تین یتیم بچے (عرش کے دو بھانجے اور ایک بھانجی) اور عرش کی اولاد معنوی ان کا ڈھائی ہزار اشعار کا مجموعہ کلام باقی ہے جو مرحوم کی والدہ نے انتقال سے قبل راقم السطور کو اپنا ایک ادنیٰ غمگسار سمجھ کر سپرد کر دیا تھا۔

یہ کلام بطور ایک قیمتی امانت کے میرے پاس محفوظ ہے لیکن اس

خیال سے کہ زندگی اور موت کا کیا اعتبار میں اس امانت کو اپنے اہل ملک تک پہنچانا چاہتا ہوں اور یہ جب ہی ممکن ہوگا کہ کلام مذکور زلیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہو جائے۔

فی زمانہنا محمد اللہ ملک میں اردو ادب سے (نثر، ہویا نظم) روز افزوں محبت بھی بڑھ رہی ہے اسی لئے یقین واثق ہے کہ عرش فاروقی مرحوم کا یہ ”جاندار کلام“ زندہ جاوید رہے گا۔

لیکن چونکہ کلام کے انتخاب اور اس کی مناسب ترتیب و طباعت کے لئے کافی وقت درکار ہے اس لئے بعض عزیز دوستوں کے مشورہ کے مطابق بالفعل بطور ”تعارف“ عرش فاروقی کی ”رباعیات“ ملک کے سامنے پیش کرتا ہوں یہ طریقہ کار اس اعتبار سے بھی غالباً مفید ہوگا کہ نقادانِ سخن اس ”مشتملہ نمونہ از خردارے“ کو ”جاپنچ اور“ پرکھ سکیں گے اور اگر ”نمونہ کلام“ اہل فن کے نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر کامیاب آتا تو باقی کلام کی مقبولیت عام انشاء اللہ آسان ہو جائے گی۔

آخر میں استاذی حضرت مولانا احسن مارہروی، مولوی نظام حسن صاحب نظامی بدایونی، خواجہ غلام السیدین صاحب، پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی، مولوی عقیل الرحمن صاحب اور مکرمی آل احمد سرمد ایم اے کامنوں ہوں کہ انہوں نے قبل طباعت ان ”رباعیات“ کو اول نظر ملاحظہ فرما کر نہایت پسند کیا اور میری اس ناچیز خدمت کو سند قبول عطا فرمائی۔ سب سے زیادہ قابل قدر تسائش

حضرت نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب
شروانی مدظلہ نے فرمائی ہے موصوف نے لکھا ہے کہ :-

”عرش فاروقی مرحوم کے کلام میں آمد، جودت اور
جدت ہے سلاست کے ساتھ مضمون آفرینی ہے
عام سطح سے پایہ کلام بہت بلند ہے۔ اتنی کم عمری کے
لحاظ سے تعجب آفرین ہے۔ افسوس کہ مرحوم کی جوانی
کو نظر لگ گئی۔“



محمود گاوواں

(تصنیف: پروفیسر محمد ہارون خاں شروائی)

انگریزی زبان میں یہ قیمتی کتاب پروفیسر محمد ہارون خاں صاحب شروائی ایم، اے (اکسن) چیرمین شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے تالیف کی ہے اور کتابستان الہ آباد نے شائع کی ہے۔ پروفیسر شروائی ایک عالم باعمل شخص ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں اپنے بلند پایہ مقالات اور فاضلانہ تالیفات کے ذریعہ ہمیشہ قیمت اور نادر معلومات کا اضافہ فرماتے رہے ہیں۔ کتاب زیر نظر آپ کے تاریخی کارناموں میں شاہکار کا مرتبہ رکھتی ہے۔

تاریخ ہند کے عہد وسطیٰ میں مشہور بہمنی سلطنت کے نامور وزیر محمود گاوواں ایک عظیم المثال شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۲۵۳ء میں جبکہ ان کی عمر چالیس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اپنے وطن مالوہ گیلان سے جلا وطن ہو کر ساحل بمبئی کے بندرگاہ دیول میں ایک گمنام شخص کی حیثیت میں وارد ہوئے اور وہاں سے سلطان علاء الدین احمد ثانی کے عہد میں بہمنی سلطنت کے دارالحکومت بیدر میں پہنچے۔ بہمنی سلاطین جوہر شناسی میں فرو تھے۔ اس گمنام اور غریب الوطن جوہر قابل کی قدردانی میں، دیہانہ لگی۔ اور محمود گاوواں

خدمتِ ملک اور اپنی قابلیت کے زور سے ترقی کر کے نہ صرف وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ جلیلہ پر پہنچے۔ بلکہ مہارتِ جنگِ تدبیرِ مملکت اور علمی کارناموں کی بدولت ساری دنیا میں جعفر برہکی اور نظام الملک طوسی کی سی شہرتِ دوام کے مالک بن گئے۔

پروفیسر شروانی کی یہ کتاب تلاش و تحقیق عمدہ ترتیب مضامین اور حسن بیان کا ایک قابل تعریف نمونہ ہے درحقیقت موصوف نے یہ کتاب لکھ کر ملک و ملت پر بڑا احسان کیا ہے لیکن اس سلسلہ میں مزید تمنا یہ ہے کہ محمود گواں کے حالاتِ زندگی اردو زبان میں بھی شائع ہوں اور یہ کام شروانی صاحب باسانی کر سکتے ہیں کیونکہ آپ انگریزی کی طرح اردو بھی بہت اچھی لکھتے ہیں، اپنے اس علمی کارنامہ کی وجہ سے اگر ایک طرف پروفیسر ہارون خاں شروانی ہماری تعریف و توصیف کے سزاوار ہیں تو دوسری طرف محسنِ قوم عالی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی مدظلہ العالی بھی قوم کی دلی شکرگزاری کے مستحق ہیں کہ آپ نے اپنے کتاب خانہ حبیب گنج سے ریاض الانشاء کا تادم الوجود نسخہ مرحمت فرمایا جس کی بنیاد پر ”محمود گواں“ کے صحیح حالات روشنی میں آسکے۔

کتاب با تصویر ہے۔ کاغذ چھپائی۔ جلد۔ نفیس اور ولایت کی چھپی ہوئی کتابوں کی طرح دیدہ زیب ہے۔

قدیم ہندوستان

تصنیف: ڈاکٹر سید معین الحق

مصنف سید معین الحق صاحب ایم۔ اے لکچرار شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے قدیم دور جس کو اکثر ہندوؤں کا عہد بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخ کے طلباء کے لئے سب سے زیادہ مشکل دور ہے۔ ہماری بدقسمتی سے ہندوستان کے عہد قدیم کی کوئی ہم عصر تاریخ اس وقت موجود نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس ملک میں فن تاریخ کا قطعی رواج نہ تھا اور سب سے پہلا شخص جس نے اس طرف توجہ کی البیرونی تھا۔ پروفیسر پین کا یہ قول کہ ہندوستان میں نہ کوئی ہیرو ڈوٹس ہوا ہے اور نہ تھوسی ڈاٹس اور نہ کوئی لوٹی، ہوا ہے۔ نہ ٹیسٹین، بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ ہم کو عہد قدیم کی تاریخ کے لئے ان ذرائع معلومات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو دوسری قوموں کی تاریخ کے مطالعے میں تصدیق اور تحقیق کے لئے درکار ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ کتابیں جو دوسرے مضمین پر لکھی گئی ہیں لیکن تاریخ کے اہم مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس سلسلہ میں وید۔ رامائن۔ مہا بھارت۔ پران، اپنشد کے علاوہ

۱۵ حال جنرل سکرٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی

بادشاہ اور چین مذہب کی کتابیں بھی مفید و کارآمد ثابت ہوئی ہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آریوں کی قدیم تہذیب و تمدن کے لئے ہمارے پاس رگ وید کے علاوہ اور کوئی ذریعہ معلومات نہیں۔ قدیم کتبوں اور سکوں کا مطالعہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ اشوک کے کتبے، اُس کے عہد کی تاریخ کے لئے ایک بے بہا ذخیرہ معلومات ہیں جن کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم کو یہ تمام کتبے دستیاب نہ ہوتے تو اس مشہور شہنشاہ کے کارناموں سے بڑی حد تک تاریخ کے طلباء بے خبر رہتے۔ اس قسم کی لاتعداد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم کتابوں، سکوں اور عمارتوں کو بغور مطالعہ کرنے میں بعض اوقات معلومات کے وہ جواہر پارے دستیاب ہو جاتے ہیں جو تاریخی کتابوں میں نہیں مل سکتے۔ حال میں "موہن جوڈارو" اور ہڑپا، میں جو پیرانے شہروں کے کھنڈر نکلے ہیں ان کے مطالعہ سے عہد قدیم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے اور یہ امر پاپیہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ آریوں سے قبل بھی ہندوستان کی تہذیب بہت ترقی کر چکی تھی۔

ہم پروفیسر معین الحق صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ کاغذ کی گرانی و کمیابی کے باوجود اُسٹھوں نے مذکورہ بالا کتاب شائع کر کے تاریخ کے طلباء پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس تاریخ کی تصنیف کا مقصد اولین یہ ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طالب علموں کے لئے ایک مختصر مگر مستند کتاب تیار کی جائے تاکہ اُن کو عہد قدیم کی تاریخ پڑھنے اور سمجھنے میں سہولت ہو۔

قابل مصنف مسلم یونیورسٹی میں گزشتہ پندرہ سال سے لکچراری کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور کتاب کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اس طویل تجربہ سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ کتاب کی زبان سلیس اور شگفتہ ہے۔ واقعات کی ترتیب میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ تو اتر بھی قائم رہے اور طالب علم کو ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ بھی ہو سکے، عہد قدیم کے ہندوستانی فلسفہ اور مذہب کے بعض مسائل کا بھی اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے لیکن انداز بیان اس قدر دل چسپ ہے کہ معمولی استعداد رکھنے والے طلبا بھی اس کو باسانی سمجھ سکتے ہیں۔ طلبا کے علاوہ یہ کتاب ہر اُس شخص کے لئے بھی کارآمد و مفید ثابت ہوگی جو تاریخ ہند کے دور قدیم اور اُس زمانہ کے تہذیب و تمدن سے دل چسپی رکھتا ہے۔

مقدمہ میں ہندوستان کے قومی اختلافات پر بحث کی گئی ہے اور اس دل چسپ مسئلہ کے تاریخی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لایق مصنف نے بتلایا ہے کہ کس طرح عہد قدیم اور قرون وسطیٰ میں اس ملک پر مختلف اقوام و مذاہب کے لوگ حملہ آور ہوئے اور بعد میں اسی کو اپنا وطن بناتے رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان مختلف قوموں کی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی کشمکش کا جولاں نگاہ بنا ہوا ہے اور "قوموں کا عجائب خانہ" کہلاتا ہے۔

کتاب مصنف سے مل سکتی ہے۔

یادگارِ نصیر

(مولوی محمد نصیر الدین علوی)

مجموعہ انتخاب کلام مولوی محمد نصیر الدین صاحب علوی جو پوری ایم اے ایل ایل بی علی گڑھ کی غزلیات، قصائد، سلام، اور بیانیات پر اردو زبان میں مشتمل ہے، کچھ حصہ کتاب میں فارسی غزلیات بھی ہیں کتاب کے شروع میں مشاہیر شعراء ہند یعنی جگر مراد آبادی، احسن مارہروی، وغیرہ کے چند تعزیت نامے بھی ہیں۔ ایک دل چسپ اور ساتھ ہی رقت آور مضمون جناب پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا ہے جو نصیر مرحوم کی یاد اور جدائی میں لکھا گیا ہے مرحوم لطیف مذاق شعری رکھتے تھے۔ کلام میں روانی اور آئندہ ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فطرت شاعرانہ تھی تخیل کی بلند پروازی، جدتِ فکر، راز و نیاز، سوز و ساز، خم و خمخانہ، شمع و پروانہ، مجاز و حقیقت سب مزے آپ کے کلام میں موجود ہیں۔ اکثر و بیشتر اشعار ایسے ہیں جو آراباب سخن کے قلوب کو تڑپانے کے لئے تیر و نشر کا کام دیتے ہیں۔ چند متفرق اشعار درج کئے جاتے ہیں:-

سینے پر رکھ کے ہاتھ کیوں پوچھ رہے ہو حالِ دل
کل کی طرح نہیں ہے درد آج ہے کچھ قرار سا

احساسِ ہجر و وصل بھی باقی نہیں رہا!
ایسا خیالِ دوست نے حیراں بنا دیا

کیا احتیاج ہم کو کسی شے کی اے نصیر
سب کچھ ملا اگر دلِ درد آشنا ملا

یہ تو ہمارے حُسنِ نظر پر ہے منحصر
میرے ریاضِ دل کی خزاں کیا بہا رکیا

قدموں کے نیچے فتنہ محشر لے ہوئے
وہ آ رہے ہیں آج ہمارے مزار پر

غرض کہ مرحوم دورِ حاضر کے ممتاز شعراء میں سے تھے۔ آپ کا کلام دلپسند
و موثر ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے علاوہ کمالِ شاعری کے مرحوم اور بھی
بہت سی خوبیوں کے حامل تھے، باوجود اعزازِ دینی نہایت منکسر المزاج اور
مرنجان مریخ افراد میں سے تھے۔ یگانوں اور بیگانوں میں ہر دو عزیز تھے۔ مرحوم نے
پانچ لڑکے اور ایک بیوہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ضرورت ہے کہ نصیر صاحب
کے اجابِ ادب تو ازاد و فنِ شعر کے قدردان اصحاب آپ کا دیوان خرید کر
آپ کے متعلقین کی ہمت افزائی اور اعانت فرمائیں۔

۱۵ افسوس ہے ہٹے ہا جزوہ فصیح الدین کا گذشتہ سال کراچی میں انتقال ہو گیا

دیوان کی طباعت و کتابت نہایت عمدہ اور صاف ہے۔ اور صحت کا بھی پورے طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس خصوص میں مرحوم کے چھوٹے بھائی مولوی ظہیر الدین علوی صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی کی کوشش قابل تعریف ہے۔ دیوان کی قیمت ایک روپیہ چھپیس پیسے ہے۔



اس پر فیسر ظہیر الدین صاحب سابق لکچرار شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی و سابق ریٹائر جامو اردو علیگڑھ بھی اشد کو پیارے ہونگے۔

نشریات

(تصنیف: پروفیسر محمد ہارون خاں شروانی)

پروفیسر محمد ہارون خاں صاحب شروانی کی یہ دوسری نئی کتاب ہے جس کو سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب چارمینار حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔ اُردو زبان میں شروانی صاحب کی ۲۸ تاریخی، سیاسی، تعلیمی مذہبی اور معاشرتی مباحث پر ریڈیائی تقریروں کو اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ ہر تقریر مفید اور نئی معلومات کی حامل ہے۔ زبان جوشیلی، شگفتہ اور صاف ستھری ہے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی کاغذ اور عمدہ سلائی کٹائی نے اس کی خوبی میں چار چاند لگا دیے ہیں، بہت کم اُردو کی کتابیں اس قدر دیدہ زیب دیکھنے میں آئی ہیں۔



نقشِ فرنگ

(تصنیف: قاضی عبدالغفار صاحب)

«ایک ادیب، صحیفہ نگار، اور مصنف کی حیثیت سے قاضی عبدالغفار صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، جمہور، صباح، اور پیام، کے ایڈیٹر کو کون نہیں جانتا۔ اسی طرح مجنوں کی ڈائری، لیلیٰ کے خطوط، اور آثار جمال الدین افغانی اور حیاتِ اجل بھی قاضی صاحب کی مشہور تصانیف ہیں لیکن مجھے موصوف کی پہلی تصنیف «نقشِ فرنگ» سب سے زیادہ پسند ہے، یہ کتاب ۱۹۲۲ء کے «وفدِ خلافت» کے سلسلہ میں اقصائے مغرب کے ولادیز حالات سفر پر مشتمل ہے۔ ۱۹۲۳ء میں دارالاشاعت پنجاب نے شائع کیا۔

بہشتی سے رخصت ہونے اور جہاز کی روزانہ زندگی کے دلفریب مناظر و تاثرات خصوصیت سے قابل ملاحظہ ہیں۔



تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کی

دنیا کے — نام

(تصنیف: مولانا عبد الماجد دریا آبادی)

مولانا عبد الماجد دریا آبادی مدظلہ العالی جن کی شخصیت بوجہ کمالِ علم و فضل دُنیا کے علم و اسلام میں محتاج تعارف نہیں۔ مندرجہ بالا عنوان پر بصیرت افروز مقالہ آپ ہی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ نہایت جامع مقالہ ہے، طرز بیان دلپذیر۔ موثر، اور فاضلانہ ہے۔ تمدنِ اسلام کے متعلق تمام پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے، مقالہ پر مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب مہتمم جامعہ قاسمیہ دارالعلوم دیوبند نے ایک تقریظ تحریر فرمائی ہے۔ یہ مقالہ اس قابل ہے کہ مسلمان اس کا عمیق نظر سے مطالعہ کریں اور اس پر عامل ہو کر اپنے تمدن اور اپنی معاشرت کو مکمل طور پر اسلامی بنائیں۔

ذکر الجیب

(تصنیف: مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی)

عالی جناب نواب صدر یار جنگ بہاور، مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی با نقابہ رئیس جیب گنج ضلع علی گڑھ کی چند تقاریر میلاد یہ کا مجموعہ ہے، جو صاحب ممدوح نے بزمانہ صدر الصدوری مملکت آصفیہ و بعد سبکدوشی ۱۳۳۵ھ سے ۱۳۵۰ھ تک مختلف اوقات میں حیدرآباد دکن میں فرمائیں اور جنکو جناب محمد اکبر علی صاحب نے شائع کیا ہے۔ جناب نواب صاحب ممدوح کی ذات گرامی دنیائے علم و ادب میں تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ مشہور انشا پرداز ہیں، آپ کے بلند پایہ مضامین اکثر موقر اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کا مطالعہ کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری اور فیض رساں ہے، جناب ممدوح کا یہ مجموعہ تقاریر (ذکر الجیب) ایسا دلکش ہے کہ ختم کئے بغیر اسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ نہایت مبسوط تقاریر ہیں۔ سیرت النبیؐ پر یہ شگفتہ بیانی، فصیح اللسانی اور واقعہ گستری آپ ہی کا حصہ ہے دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ نہایت جامع مجموعہ ہے۔ بیان میں تسلسل، روایات میں صحت و واقعات میں صداقت اور استدلال میں نتائج غرض کہ

خوبیاں ہی خوبیاں ہیں جو مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں زیر نظر مقالہ (ذکر المجیب) اور علاوہ اس کے آپ کی اور تصنیفات و تالیفات مثلاً «علمائے سلف»، «سیرۃ الصدیق»، «ذکر جمیل» وغیرہ یہ سب اس قابل ہیں کہ ہر مسلمان بچہ، بوڑھا اور جوان ان کا بغور مطالعہ کرے۔ اور ان پر عمل پیرا ہو کر فلاح دارين حاصل کرے، ان تصانیف کو پڑھ کر اصلاح اخلاق و معاشرت ہوتی ہے۔ آپ کی سب تصانیف سبق آموز اور علمی و مذہبی ہیں جن کے مطالعہ سے دین میں پختگی اور راسخ العقیدگی پیدا ہوتی ہے۔



ہمارے ہندوستانی مسلمان

(مترجمہ: پیرزادہ عبدالباسط ایم اے)

کیا ب قلمی کتابوں کی طرح بکثرت ایسی مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جن کے نسخے قریب قریب ناپید ہو چکے ہیں۔ ان کے اقتباسات اور حوالے دوسری کتابوں میں ملتے ہیں لیکن اصل کتابیں لاپتہ ہیں۔ اسی قسم کی ایک کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" مصنفہ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر ہے جو ۱۸۷۱ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی اور جس کا جواب سر سید علیہ الرحمۃ نے لکھا تھا۔ عرصہ کی مفقودہ انگریزی کے بعد کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے کام کے سلسلہ میں اس کا علم جناب ڈاکٹر مریضیاء الدین احمد صاحب کو ہوا، ان سے یہ کتاب مولانا سید طفیل احمد صاحب کے ہاتھ میں پہنچی اور مولانا صاحب کی تحریک و ترغیب پر ۱۹۳۹ء میں ہمارے دوست پیرزادہ عبدالباسط صاحب پھراپونی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پروفیسر علوم مشرقیہ اسلامیہ کالج لاہور نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔

زیر نظر ترجمہ کیسا ہے؟ اس قطع نظر کے اصل کتاب کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ ہنٹر نے اس میں مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ ضروریات پر بحث کر کے حکومت برطانیہ کو ان کی ذہنیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلے حضرت سید احمد صاحب شہید بریلوی کی تحریک کے

مفصل حالات اور سرحد پار ڈوباہیوں کی باغیانہ سازشوں کی مکمل داستان درج ہے۔ مسلمان مفتیوں کے فتوؤں اور مسئلہ جہاد پر مباحث ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کس طرح دارالحدیث سے دارالاسلام ہو گیا۔ انگریزی عہد حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ انصافیوں کے عنوان سے قاضیوں اور مفتیوں کے عہدوں کی شکست اور شریعت اسلامی کے بتدریج ختم ہونے کی روئیداد ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ نظام تعلیم اور اسکولوں میں مسلمانانِ بنگال کی مذہبی حالت اور ملازمتوں میں ان کے تناسب کے اعداد و شمار بھی دئے گئے ہیں۔ غرض کتاب مذکور سے بہت سی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اس کا اردو ترجمہ ہماری زبان کے تاریخی ذخیرہ میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔



منتخب سعید

رائے بریلی کے ضلع میں قصبہ سلون اور وہ کے مشہور قصبات میں سے ہے یہاں ایک بہت ہی قدیم درگاہ ہے، اس سے متعلق ایک بڑی جامعہ اور موقوفہ ہے، درگاہ میں سجادہ نشینی کا سلسلہ گذشتہ تین سو سال سے جاری ہے، وہاں کے صوفی خاندانوں میں بڑے بڑے بزرگ ہو گزرے ہیں جن کی عظمت کا اندازہ ان کے معاصرین کے خطوط سے ہوتا ہے حلقہ اثر وسیع ہونے سے ان بزرگوں کے تعلقات سلاطین، امراء اور علماء سے خاص طور پر تھے جسٹس سید محمود صاحب مرحوم نے اپنے قیام رائے بریلی کے دوران اس خاندان کی تاریخ ”میمورنڈم آف دی محٹن انڈاؤمنٹ ایٹ سلون“ کے نام سے لکھی ہے گورنمنٹ ڈسٹرکٹ گزیٹیٹر میں بھی حالات موجود ہیں۔

حسن اتفاق سے قلمی خطوط کا ایک مجموعہ موسوم بہ ”منتخب سعید“ دستیاب ہوا ہے اس میں خاندان کے بزرگوں کے نام اٹھارویں اور انیسویں صدی کے علماء، امراء اور سلاطین کے خطوط ہیں۔ کتاب ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۰ء کی تالیف ہے ان خطوط سے نہ صرف اس خاندان کا اثر، اس کی عظمت اور اس کے بزرگوں کے مرتبہ کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس عہد کی معاشی، علمی اور ادبی تاریخ پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے، ان خطوط کا ترجمہ ہماری فرمائش پر اسی خاندان کے

ایک ہونہار فرد حافظ شاہ محمد ہادی عطاء صاحب حفید اکبر حضرت شاہ مہدی عطاء صاحب قدس الشہداء نے فارسی سے اردو میں کیا ہے۔

کتاب کے پانچ باب ہیں اور آخری باب میں خاندانی نجی خطوط ہیں ، دوسرے باب میں سلاطین و شاہزادگان کے خطوط ہیں جو دلچسپ ہیں اور ان سے ان کی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ تیسرے باب میں امراء کے خطوط ہیں۔ بعض مرزاقتیل کی بیاض سے نقل کئے گئے ہیں جو اس عہد کی زبان فارسی کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان خطوط سے سیاسی معلومات پر بھی کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ چوتھے باب میں علماء کے خطوط ہیں ان میں سے حضرت شاہ عبدالعزیز رح حضرت سید احمد صاحب شہید رائے بریلوی اور مولانا اسمعیل صاحب شہید کے خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مرزاقتیل کے خطوط بھی اس باب میں شامل ہیں جن سے شاعر کی زندگی کے بہت سے اوجھل پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

کتاب دراصل ایک بڑے مجموعہ مکاتیب "اشرف الانشاء" کا انتخاب ہے اسے خاندان کے سجادہ نشین نجم حضرت شاہ پناہ عطاء صاحب قدس سرہ کے چھوٹے بھائی شاہ غفور عطاء صاحب نے منتخب و مرتب کیا ہے۔

خاندانی قلمی کتب و دستاویزات کے علاوہ سحۃ المرجان (آزاد بلگرامی) ابجد العلوم (نواب صدیق حسن خاں) نزہۃ الخواطر (مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم مصنف گل رعنا) اخبار الاخبار (حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی) وغیرہ جیسی بلند پایہ کتابوں میں بھی خاندان اور متعلقین خاندان کے جستہ جستہ

ہمارے مطالعہ میں ایک اور موقوف تحریر بھی آئی ہے جس میں سجادہ نشین
ہفتم حضرت شاہ مہدی عطاء صاحب قدس بھرہ کا عدالت کے سامنے ایک
باضابطہ بیان خاتمان کی تاریخ کے متعلق مندرج ہے لہ

لہ پاکستان میں کتاب "منتخب سعید" کا پتہ جناب شاہ حسن عطاء ایم اے حال مقیم لاہور
(تہذیب الاخلاق ٹرسٹ) سے معلوم کیا جاسکتا ہے (بریلوی)

بوستانِ حسرتِ شروانی

تصنیف : مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (صدر یار جنگ)

فارسی زبان کی شیرینی اور فارسی غزل کی رنگینی کون نہیں جانتا۔ غلام شبلی نے سچ کہا ہے ”عشق و محبت کا جذبہ فطرت انسانی کا خمیر ہے۔ اس لئے تمام دنیا کی شاعری میں عشقیہ شاعری، اور سب انواع شاعری سے زیادہ متداول اور عام ہے۔ لیکن ایران اس خصوصیت میں تمام دنیا سے بڑھا ہوا ہے۔“ حقیقت ایران کی تہذیب و تمدن، عیش و تنعم، آب و ہوا اور حسن و جمال نے اہل ملک کے جذبات عشق و محبت میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ سعدی، حافظ، عرفی نظیری کسی کی غزل اُسٹھا کر دیکھتے تو آپ پائیں گے کہ عشق کے نازک سے نازک جذبات، اور حسن کی لطیف سے لطیف ادا کو یہ لوگ اس خوبی سے بیان کر جاتے ہیں کہ ذوقِ سلیم وجد کرنے لگتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ محبوب کی آمد پر تمام شکوے شکایتیں ختم ہو جاتے ہیں اس کو سعدی یوں ادا کرتے ہیں :-

۱۔ بیضِ استادی پر و فیسرفیاء احمد بدایونی مدظلہ، تحریر شد (بریلوی)

۲۔ شعرا بجم جلد پنجم

۳۔ غزل کے موافق و مخالف، حال میں بہت کچھ کہا گیا ہے، مگر یہاں اس بحث کا محل نہیں۔

گفتہ بودم چو بیانی غم دل پا تو بگویم !!
 چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیانی
 یا یہ بیان کرنا ہے کہ معشوق کی اداؤں کے سامنے جان کی کوئی قیمت
 نہیں۔ اس کے لئے حافظ یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں :-

اے خوشا حالتِ آن مست کہ در پائے حریف

سر و ستار نداند کہ کدام اندازو !!

اس مست کی حالت قابل رشک ہے جو مستی میں معشوق کے قدموں پر
 نچھاور کرنے کے لئے یہ نہیں جانتا کہ سر نہر کروں یا دستار یا مثلاً عاشق کی
 وحدت پسند طبیعت غم روزگار کو بھی غم عشق میں جذب کر لیتی ہے۔ اس مضمون
 کو عرفی نے کس خوبی سے ادا کیا ہے :-

در دل ما غم دنیا غم معشوق شود

بادہ گر خام بود پخت گند شیشہ ما

اسی طرح نظری محبوب کے آفتاب و شمع ہونے کی طرف کس لطف

سے اشارہ کرتا ہے کہتا ہے :-

بام و درم ز درہ و پروانہ پر شدہ است

بازم بہ کلبہ کیست نہ شمع و نہ آفتاب

لہ غالب لکھتے ہیں :-

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق

جو غم ملا اسے غم جانان بنا دیا (اعتراف)

کہ آلام روزگار کو آساں بنا دیا

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
 ادھر آتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ جاتا ہے

تہ داغ کا شعر ملاحظہ ہو :-

یعنی میرے جھونپڑے میں کون آگیا کہ شمع و آفتاب کے نہ ہوتے بھی تمام گھر دروں اور پر والوں سے بھر گیا ہے۔ غرض مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔ مقصود یہ ہے کہ فارسی غزل ایک باغ پر بہا رہے جس کی کسی روش پر بھی نکل جائے و باغ معطر ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں فارسی کا مذاق غزنویوں کی آمد سے شروع ہوتا ہے فارسی کا پہلا شاہراہ غالباً مسعود سعد سلمان ہے جو عہد سلطان ابراہیم غزنوی میں لاہور کا گورنر تھا۔ اس کے بعد پٹھان سلاطین کے دور حکومت میں ہمیں جمال دہلوی حسن بدایونی (جو حسن سنجر کی دہلوی کہلاتے ہیں) بدر چاچی۔ مظہر گجراتی وغیرہ متعدد خوش گوشعرا ملے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو کے کوکبہ خسروی نے سب کو..... شوکت کو ماند کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ مغلیہ حکومت کا عہد آگیا۔ مغل بادشاہ و امراء نہ صرف قدروان بلکہ خود سلیم المذاق تھے ہر طرف دولت و ثروت کی افراط۔ اور حسن و عشق کی چہل پہل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے فارسی شعراء ہندی الاصل ہوں یا ولایت زرا۔ کمال فن اور لطف سخن میں ایرانیوں سے بازی لے گئے خود صائب کا اعتراف سنئے کس مزے سے کہتا ہے :-

نیست در ایراں زمین سامان تحصیل کمال

تا نیامد سوے ہندستان حنارنگیں نہ شد

اصل یہ ہے کہ بابر و ہمایوں نے شعر و ادب کے پودے کی پرورش کی۔

۱۰ ملاحظہ ہو کلیات حسن مطبوعہ حیدرآباد ۱۰۰۰ ہ ہند رفتن حنا فارسی کا ایک محاورہ ہے جس سے حنا کا سیاہی مائل ہونا مراد ہے۔

اکبر کے عہد میں یہ تناؤ در درخت بن گیا جہانگیر و شاہجہاں کے دور میں اہل کمال نے اس کا پھل کھایا اور اسی کے سایہ میں آرام پایا۔ اکبرؑ کی دربار کے شعراء کی فہرست جو ابوالفضل۔ بدایونی اور نظام الدین نے دی ہے کافی طویل ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ آخری مغل بادشاہ کے زمانہ میں خاتم الشعراء مرزا غالب پر آ کر ختم ہو گیا۔ مرزا خود کہا کرتے تھے کہ ہند میں فارسی شاعری ایک ترک لاجپن (خسرو) سے شروع ہوئی اور ایک ترک ایک (غالب) پر ختم ہو گئی۔ مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ غالب کے بعد کوئی شاعر یا اچھا شاعر پیدا ہی نہیں ہوا البتہ یہ درست ہے کہ کوئی صاحب طرز مشہور استاد منصف مشہور پر نہ آیا۔۔۔ غالب اور ان کے معاصرین کے بعد بھی فارسی کے بعض خوش گو شعراء پیدا ہوئے جن میں حالی۔ شبلی۔ خواجہ عزیز۔ شاہ عزیز۔ اشعر عزیز وغیرہ قابل ذکر ہیں اسی قابل ذکر گروہ میں جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی مدظلہ کا بھی شمار ہے۔ نواب صاحب کی ذات مستجمع الصفات کو اگر اس لحاظ سے ذوالریاستین کہا جائے تو بجا ہے کہ قدرت نے آپ کو دنیاوی ریاست کے ساتھ علم و ادب کی صدارت بھی عطا فرمائی تھی آپ کا علم و تجربہ فراست

۱۵ اسی دور میں اگر فارسی شاعری نے ایک خاص انداز اختیار کیا جس کو سبک ہندی سے تعبیر کرتے ہیں اگرچہ اس کی بنا خسرو کے عہد ہی سے پڑ گئی تھی ۱۶ اقبال ایک نئی شریعت شاعری کے مجتہد ہیں۔ اس لئے ان کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا ۱۷ غالب نے ایک شعر میں اپنے معاصرین کا ذکر کیا ہے

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ

خسرتی اشرف و آرزوہ بود اعظم شان

۱۸ یوں تو تقریباً ہر شہر میں فارسی کے اچھے شاعر ہو گئے۔ رہے ہیں مگر انکو شہرت عام کے دربار میں جگہ ملی

وتدبر۔ ۱۹۹۰ کتب خانہ اور مذہبی و قومی کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ جن پر یہاں نہ بحث کی ضرورت نہ موقع۔ ہمارا مقصد صرف نواب صاحب کے فاسی کلام موسوم بہ بوستان حسرت پر اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ یہ ایک مختصر سا مجموعہ ہے جو ۲۸ غزلیات ایک مختصر نعت اور چند قطعات تاریخی پر مشتمل ہے۔ متعدد روایات خالی ہیں اور کسی میں ایک ایک دو دو غزلیں ہیں اور رسمی شاعروں کی طرح روایوں کی خانہ پوری کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ موصوف کو شعر و ادب سے فطری ذوق ہے۔ اور اسی ذوق کے ماتحت کسی خاص تحریک یا جذبہ سے متاثر ہو کر اچھا نا فکر شعر فرماتے ہیں۔ تاہم دیوان کا ہر پڑھنے والا اس نتیجہ پر پہنچے گا، کہ آپ کے یہاں اس مختصر مجموعے میں بھی رفعت خیالات و صدق جذبات کے ساتھ لطافت بیان اور سلاست زبان کی کمی نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں اپنے دعوے کے ثبوت میں موصوف کے دیوان سے چند مثالیں پیش کریں معشوق کی لطافت طبع کے متعلق ایک موقع پر نہایت لطیف پیرایہ اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ابن ہریرہ یا کئی گوہر نتواں یافت نجاک

مگر از شیرہ جانت بد نے ساختہ اند

یعنی عنصر نما کی میں یہ لطافت بھلا کہاں سے آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ شاید تیرا جسم روح کے جوہر سے بنا ہے، غور کرنے کی جگہ ہے جس کے جسم کی

لطافت کا یہ عالم ہے کہ روح نہیں بلکہ روح کے جوہر سے اس کا خمیر ہوا ہے

تو خود اس کی روح کی پاکیزگی کس پائی کی ہوگی۔

درحقیقت تصور کے لئے کس قدر وسیع میدان شاعر نے مہیا کر دیا۔

العظیۃ للشہ۔ اسی غزل میں کہتے ہیں۔

مبت را محشر ناز و غنچہ پر نکشند

مہر خوشانے کہ بوئے دہنے ساختہ اند

عاشقانِ مست جو کسی کی بوئے دہن پر قناعت کئے بیٹھے ہیں مشک

وغنچہ کی خوشبو کا احسان نہیں اٹھایا کرتے۔ ”بوئے دہنے“ کا ٹکڑا جو لطف

دے رہا ہے وہ ادبِ فارسی کے ادائنا سوں سے پوشیدہ نہیں۔ نواب صاحب

کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مخاطب اگرچہ جن مجازی کا پیکر

اور گوشت پوست کا واقعی انسان ہے لیکن جمالِ ظاہری کے ساتھ کمالِ معنی سے

آراستہ ہے اسی کے ساتھ خود ان کا جذبہ محبت بھی پاکیزگی اور وفا پرستی کے

اوصاف سے متصف ہے، ملاحظہ ہو۔

من و خیال رُخے، بے نیازم از گلشن

من و جمال ہے، آفتابِ را چہ کنم !!

بے نیازانہ ز سیر گل و گلشن گزند

بیدلانے کہ بگل پیرہنے ساختہ اند

بعض پوری کی پوری غزلیں کسی خاص واقعے سے متاثر ہو کر لکھی ہیں

جن میں واقعیت کی بنا پر تاثیر اور مسلسل ہونے کی وجہ سے زور پیدا ہو گیا

ہے سچ ہے :-

از دل می خیزد و بردل می ریزد مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے

در حریم وصل جانانم وطن خواہد شدن
شمع بزم انس آن ماہِ ختن خواہد شدن

یا

رہو وہ ہوش و قرارم غزال رعنائے
نگار مست خرامے بلند بالائے

اکثر غزلیں اساتذہ قدیم کی زینوں میں لکھی ہیں اور کامیاب شعر نکالے ہیں جن پر کہیں کہیں علامہ شبلی اور خواجہ عزیز جیسے سخن گو اور سخن سنج ناقدانِ ادب نے تحسین فرمائی ہے۔ حضرت ممدوح کے کلام میں متعدد مواقع پر عالی ہمتی و بلند حوصلگی کے مضامین اس خوبی سے نظم ہوئے ہیں کہ بے ساختہ دل سے داہ نکلتی ہے۔ چند مثالیں سنئے اور لطف اٹھائیے۔

مثلاً جب آپ حیدرآباد سے ترک تعلق کر کے وطن کی جانب واپس آ رہے ہیں تو ریل کے سفر میں یہ شعر کہا

شاہباز ہمتم ربطے بدستِ شاہِ داشت
خوش نہ کردہ بند دستِ دیگران پر راز کرد

شاہباز کا بادشاہوں کے ہاتھ سے تعلق قدیم رواج کی طرف اشارہ کر رہا ہے شعر کا مطلب ہے کہ جب تک بادشاہ کے ہاتھ سے تعلق رہا میری ہمت کا شاہباز پابند رہا لیکن جب دوسرے لوگ دخیل ہو گئے تو اس کو یہ محکومی گوارا نہ ہوئی اور اڑ گیا۔

ہمت ماسرخی آرد ببال وند فرود
دولتِ مالس بوواں شونِ سیم اندام ما

اگرچہ انداز میں کوئی ندرت نہیں تاہم شعر سے شاعر کی عالی ظرفی کا پتہ چلتا ہے۔

سر آزاد گماں برپائے دون طبعان بود حیف است
اگر خاک رہ جانان نشد بردار بایستے

آزاد مزاجوں کے سر کے لئے دوہری مصروفیت یا حمل ہو سکتے ہیں۔ یاراہ دوست کی خاک ہوں یا دار کی زینت بنیں۔ یہ کیا غضب کہ ایسا سراور ذلیل فطرتوں کے قدموں پر۔ خیال کی رفعت اور بیان کی لطافت واد سے سے مستغنی ہے لطافت بیان کی تمثیل میں چند شعر اور ملاحظہ ہوں ان سے قارئین کرام کو محروم رکھنا ہمارے نزدیک ظلم ہے۔

دارم امید صلح ازاں چشم جنگ جو
باجین علاج تپ دل نمی کند
نہ کردہ جلوہ بت شوخ و باختم دل زین
توانم اس کہ لب خود بہ مے نیا لایم
خلق را بسکہ گمانہاست بہ ہشیاری خویش
آپ کے کلام میں بیان کی سلاست اور زبان پر قدرت کی مثالیں بکثرت ہیں مثال کے طور پر وہ نظم پڑھے جو ”کسی“ کے ریمارک کے جواب میں تحریر کی ہے۔ آغاز یہ ہے :-

اے کہ از غایت لطافت طبع

سحر نو بہار رامانی

خاتمہ کا شعر سننے کے قابل ہے۔

گفتہ طالبِ رضائے توام
من ویزواں کہ من خدائے توام

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

حسرت زبوعے باغ و ماغم نمی رسد
بوعے وفازاں گلِ خندانم آرزوست

دماغ رسیدن فارسی میں مست و سرخوش ہونے کے معنی میں آتا ہے۔

کہیں کہیں کلام میں شوخی اور بے باکی کی ادا بھی چھلکتی ہے

چوں نخواہد داشت تاپ بوسہائے بیدریغ

اں لب میگوں برنگِ یاسمن خواہد شدن

کشیم منت بخت بلند خود روز سے

کہ در کشیم ببران بلند بالا را

ممکن ہے کہ بعض ثقہ طبائع ان اشعار پر چپے بہ چپیں ہوں مگر جذبات

کے دریا کا بند باندھنا آسان نہیں چلتے چلتے دو شعر تعلق اور زور بیان کے

بھی سننے جایئے فرماتے ہیں۔

از بدخشاں لعل و از عمان گہر

جوہرِ طبعم زکانے دیگر سست

نغمہ ہائے طوطی و بلبل خوش است

حسرت مار افغانے دیگر سست

ان چند سطور پر یہ تقریب ختم کرنے سے پہلے اپنے مخدوم حضرت نواز
صدر یار جنگ بہادر مدظلہ العالی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے بغایت ذرہ نواز
مجھے اپنے کلام فارسی کو طبع کرانے اور شائع کرنے کی سعادت بخشی ع
کلاہ گوشہ و ہقاں بافتاب رسید

استاذی پروفیسر مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی کا بھی منت گز
ہوں کہ اس خوشگوار فرض کی ادائیگی میں آپ نے میرا ہاتھ بٹایا۔ جزا اللہ
خیر الجزاء

لہ "خوش گفتی و در سفتی" (حضرت شردانی)

مستقبل اسلام (فیوجر آف اسلام)

تصنیف : ولفریڈ اسکارن بلنٹ

ترجمہ : حضرت اکبر الہ آبادی،

جناب چودھری نذیر احمد صاحب کی صدارت اور مولوی عظمت اللہ صاحب ایڈووکیٹ کی نظامت میں ۱۷ اپریل ۱۹۵۱ء کو کراچی میں شاندار طریقہ پر پوم اکبر منایا گیا۔ جس میں مرحوم کے بارے میں پراثر خطبات۔ مقالے اور نظمیں پڑھی گئیں۔ یہ بھی اعلان ہوا کہ بزم اکبر کی جانب سے حضرت اکبر کے صاحبزادے میاں عشرت کی مرتب کی ہوئی سوانح عمری عنقریب شائع ہوگی۔ نیز کلیات اکبر کو بھی عمدہ طریقہ سے از سر نو طبع کرایا جائے گا۔ لیکن کسی بھی خطبے۔ مقالے یا نظم میں حضرت اکبر کی ایک خاص ادبی و تاریخی کاوش کا ذکر نہ سکر تعجب ہوا۔ میری مراد مشہور مستشرق ولفریڈ اسکارن بلنٹ کی قابل قدر کتاب "فیوجر آف اسلام" کے اردو ترجمہ "مستقبل اسلام" سے ہے۔

سید جمال الدین افغانی اور عربی پاشا المہری سے گہرے روابط کی بنا پر مستشرق ولفریڈ اسکارن بلنٹ کافی مشہور ہو چکے تھے نیز ان کی انتھک

۱۷ ایڈووکیٹ اور سابق مرکزی وزیر حکومت پاکستان علیہ یہ کام ہو گیا۔

کوششوں اور معرکتہ الآراء تصانیف نے ان کو اواخر انیسویں صدی اور اوائل بیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں میں حد درجہ ہرولعزیز بنا دیا تھا۔ چنانچہ جنوری ۱۸۸۲ء میں جب بلنٹ کی یہ کتاب قاہرہ سے شائع ہوئی تو حضرت اکبر نے فوراً اسے اردو میں منتقل کرنے کا ارادہ کر لیا ۱۸۸۳ء میں حضرت موصوف علیگڑھ میں سب جج کے عہدے پر فائز تھے لہذا وہیں ترجمہ کو مکمل کیا اور سر سید علیہ الرحمۃ کے قائم کردہ انسٹی ٹیوٹ پریس میں "مستقبل اسلام" کے نام سے اسے طبع کرایا۔

اس کتاب کا یہ مطبوعہ نسخہ راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ یہ حسن اتفاق ہے کہ خود اکبر کے قلم کا خوشخط مسودہ کتاب تقریباً ۳۲ سال کا عرصہ ہوا مجھے اپنے وطن بریلی میں دستیاب ہوا۔ (یہ یاد نہیں کہ کس طرح) عرصہ تک میرے پاس محفوظ رہا اور میں اسے اپنے ہمراہ پاکستان بھی لے آیا۔ کتاب کی تقطیع ۲۰×۳۰ اور پندرہ سطر کی ۲۶۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ خود حضرت اکبر کے دست خاص سے اس کے لکھے ہونے کی ایک سے زائد بار جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب ثروانی اور مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری مرحوم و مغفور نے مجھ سے زبانی تصدیق فرمائی یہ دونوں بزرگ حضرت اکبر کے ہم عصر اور احباب میں سے تھے، ان کے علاوہ خاتمہ کتاب صفحہ ۲۶۷ پر مشتمل خطاط جناب شیخ ممتاز صاحب جو پوری مرحوم جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس نے میری فرمائش پر حسب ذیل تصدیقی نوٹ پیر و قلم فرمایا:

"مجھ سے اور جناب اکبر الہ آبادی سے مراسم تھے اور

خط و کتابت بھی کبھی کبھی ہوتی تھی انہوں نے ایک بار مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ اوائل عمر میں ان کو خوشنویسی کا بھی شوق تھا۔ یہ کتاب ۱۸۸۲ء کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کی شانِ خط اور حضرت اکبر کے خط میں بظاہر کچھ فرق معلوم ہوتا ہے مگر بہت سے جوڑ پیوند جو اس کتاب میں نظر آتے ہیں اور روانی کے ساتھ قلم سے نکل گئے ہیں وہ اس انداز سے مشابہ ہیں جو آخر عمر تک ان کے شانِ خط میں محفوظ رہ گئے تھے۔ اس لئے میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ کتاب جناب لسان العصر اکبر آبادی کے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ ممتاز حسین چوہنپوری بقلم خود المرقوم و زور سلسلہ بمقام علیگلہ۔

مصنف کتاب مسٹر بلنٹ نے تحریک اتحاد اسلامی کو تقویت پہنچانے کی مرض سے ہندوستان کا بھی دورہ کیا تھا۔ چنانچہ جوں ہی وہ کلکتہ پہنچے حضرت میر نے ان سے کلکتہ جا کر ملاقات کی اور اپنے ترجمہ کو شائع کرنے کی نہ صرف اجازت حاصل کی بلکہ ترجمہ کے واسطے ایک ویبا چٹھنی بھی لکھوایا جو شامل کتاب ہے اس ویبا چٹھ میں بلنٹ لکھتے ہیں۔

۱۰ کتاب نیوچر آف اسلام کو زبان اردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ میں اپنی بے انتہا مسرت کا اظہار کرتا ہوں کہ میری ناچیز تصنیف کو

کو ایک لائق اور تعلیم یافتہ مسلمان اکبر الہ آبادی نے
دنیا میں سب سے بڑی مسلمانوں کی جماعت کے پڑھنے
کے لائق سمجھ کر پسند اور منتخب کیا (اشارہ برہمہ گیری
اردو) اور میرے دل پر اس بات کا بھی اثر پڑا کہ میری
مختوں کو مسلمانان ہندوستان نے تسلیم کیا اور مجھ کو
ایک بیگانہ محض اور خواہ مخواہ دخل در معقولات کرنے
والا نہیں سمجھا بلکہ درست سمجھا،

متذکرہ بالا دیباچہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بالمشافہ ملاقات میں
حضرت اکبر نے مسٹر بلنٹ کو ان کی کچھ غلطیوں سے بھی آگاہ کیا۔ اور اسلام کے بارے
میں ان کے بعض اصلاح طلب نظریوں پر توجہ دلائی جنکو تسلیم کر کے بلنٹ
لکھتے ہیں۔

”اُس کے ساتھ ہی میرے دل میں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ
شاید میں نے اپنی کتاب میں ایسے الفاظ اور فقرات
مندرج کئے ہیں جن پر اب تین سال کے بعد کے اس
عرصہ میں جبکہ مجھ کو اسلام سے زیادہ واقفیت ہو گئی اور
محبت پیدا ہوئی ہے۔ مجھ کو افسوس کرنا چاہیے۔ بلاشبہ
میں جانتا ہوں کہ اس کتاب میں بعض ایسی عبارتیں موجود
ہیں کہ جب میں نے ان مضامین کو کسی قدر عاجلانہ طور
پر لکھا تھا۔ میں اب تو دل سے ان کو واپس لیتا ہوں

الحق بعلو ولا یعلیٰ — ولفرڈ اسکازن بلنٹ کلکتہ،
یکم جنوری ۱۸۸۲ء

کتاب ”فیوچر آف اسلام“ اس کے مضامین اور مصنف کے بارہ میں
یہ کتاب کے اردو ترجمہ کی نوعیت و ضرورت کو اپنے مخصوص محتاط انداز میں
سفرت اکبر تہید مترجم کے زیر عنوان اس طرح لکھتے ہیں۔

”اپنے برادران اسلام کے سامنے کتاب فیوچر آف اسلام
کا ترجمہ پیش کرنے میں مجھ کو کچھ زیادہ تہید کی ضرورت
نہیں ہے۔ مصنف نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں عام
اس سے کہ وہ ہمارے حسبِ مراد ہوں یا نہ ہوں یا ان
کی صورت تمام تر لائق تسلیم ہو یا نہ ہو ایسے نہ تھے کہ مجھ کو
مسلمانوں کی اطلاع کے لئے اس ترجمہ کا شوق پیدا
نہ ہوتا۔ زمانہ کی رفتار نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک
غیر معمولی حالت پیدا کر دی ہے ۱۸۷۶ء میں روس نے
یورپ کے مردِ بیمار ترکی پر حملہ کیا، خلافتِ اسلامیہ کا
شیرازہ منتشر ہو رہا تھا اور تمام عالمِ اسلامی برطانوی اور
یورپین استعمار کی چیرہ دستیوں کا شکار بنا ہوا تھا۔ ایسے
وقت میں مجھ کو امید ہے کہ میں نے اپنا وقت ضائع نہیں
کیا۔ اگر سوچنے والے طبقوں کے دائرہ خیال کو وسیع
کرنے کے لئے کچھ محنت اٹھائی اور اسلام کی مجموعی

پولٹیکل اور مذہبی حالت کی نسبت انگلستان کے ایک عالی رتبہ اور ذی علم شخص کی رائے سے ان کو مطلع کیا۔ مصنف نے یہ کتاب صرف اپنے ہم ملکوں اور بالخصوص پارلیمنٹ انگلستان کو اسلام کی حالت پر توجہ دلانے کے لئے تصنیف کی تھی۔ ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہو یا اس کا ترجمہ کیا جائے۔ مسٹر حمید اللہ سلمہ نے ایک جلد کتاب انگلستان سے اپنے پدر عالی مرتبہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے ملاحظہ کو بھیج دی تھی، مولوی صاحب مدد و رح کی اجازت سے وہ کتاب میں نے پڑھی اور اس کے مضامین نے اس کے ترجمہ پر مجھ کو مجبور کیا۔ ہنوز ترجمہ ختم نہ ہوا تھا کہ مسٹر بلنٹ خود ہندوستان تشریف لائے اور بمقام کلکتہ مجھ کو ان سے ملنے کی عہد حاصل ہوئی۔ انہوں نے ایک اور دیباچہ بطور ضمیمہ دیباچہ اول کے تحریر فرمایا۔ اور مجھ کو دیا، جس کا ترجمہ میں اس کتاب کے ساتھ شامل کرتا ہوں۔ سلطنت ترکی کے قائم رہنے کی نسبت مصنف کو جو مایوسی تھی یہ دیباچہ اس مایوسی کو گھٹاتا ہے۔ مصنف نے مجھ سے یہ بھی فرمایا کہ سلطنت ترکی کی، نسبت بعض اطلاقیں ان کو خود علمائے معر و عرب سے

حاصل ہوئی ہیں اور انکی صحت کے وہ خود ذمہ دار نہیں ہیں اس ترجمہ کے حاشیہ صفحہ ۱۰ کی سطر آخر میں پندرہ سو کی جگہ پندرہ ہزار پڑھنا چاہیے۔ مصنف کو معلوم نہیں کہ کتاب انگریزی میں کیونکر غلطی واقع ہوئی۔ میں نے ادا وہ کیا تھا کہ مسٹر بلنٹ صاحب کی ان تمام اسٹیجوں کو جو ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں انہوں نے کیں اور ان ایڈریسوں کو جو مسلمانوں اور ہندو ہب کے علماء کی جانب سے ان کی خدمت میں پیش ہوئے اور اس خط و کتابت کو جو بہ رضاے لارڈ رین صفا گورنر جنرل ہند کے درمیان مسٹر بلنٹ اور گورنمنٹ حیدرآباد کے درباب قائم کرنے ایک یونیورسٹی یعنی دارالعلوم کے وقوع میں آئی۔ مسلمانوں کی اطلاع کے لئے اس کتاب میں شامل کروں۔ لیکن اس ترجمہ کے شائع ہونے میں بہت دیر ہو چکی تھی اور زیادہ دیر مناسب نہ تھی، جہاں تک ممکن تھا میں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور مصنف کے سلسلہ خیالات کو ذرا بھی بہم نہیں ہونے دیا۔ فقروں کی پیچیدگی دور کی ہے، معانی کو روشن اور کامل کرنے کے لئے ایک لفظ کے ترجمہ میں حسب ضرورت دو دو اور تین تین لفظ لکھ دئے ہیں لیکن خیالات پیچیدہ کا سہل

کرنا میرا کام نہ تھا۔

اہل علم ناظرین کتاب سے اُمید ہے کہ میری بے بضاعتی اور کم فرصتی کے لحاظ سے وہ مجھ کو معذور رکھیں گے۔ اگر اس ترجمہ میں کچھ غلطیاں پائی جائیں۔ چھاپہ اور کتابت کی غلطی تو ایک ضروری چیز ہے، اب میں ان دوستوں کا شکر یہ ادا کرتا ہوں جن کے ارشاد و تحریک نے مجھے محنت ترجمہ پر مستقل رکھا۔ جناب کنور لطف علیخاں صاحب رئیس طالب نگر۔ اسپیشل مجسٹریٹ کولہ نواب صاحب چھتاری کے عم محترم نے ایک نیا ضامنہ مدد کی اور ایک بڑا حصہ مصارف طبع کا عنایت کیا جس کا میں دل سے شکر گزار ہوں۔ اب ناظرین ورق الٹیں اور مصنف کی باتیں سنیں فقط سید اکبر حسین الہ آبادی مقام علیہ گڑھ

۲۵ مارچ ۱۸۸۶ء

پورے دیباچہ کو نقل کرنے اور زحمت مطالعہ دینے سے راقم کا یہ منشا تھا کہ اب سے ۸۰ سال قبل کے حضرت اکبر الہ آبادی کے خیالات۔ عراکم اور ماحول کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس وقت ان کا طرز تحریر کیا تھا۔

جس زمانہ میں حضرت اکبر نے اپنی کتاب پیش کی تصنیف و تالیف سے زیادہ ترجمہ کو اہمیت حاصل تھی بالخصوص اس لئے بھی کہ ہمدرد اسلام یورپین علماء

اور مفکرین کو نہ صرف زیادہ سندا اعتبار حاصل تھی بلکہ حکومت وقت کی نظر میں ان کی تحریریں زیادہ قابل گرفت بھی نہ ہوتی تھیں۔ اسی بنا پر سرسید اور ان کی سائنٹیفک سوسائٹی کے اہل قلم حضرات ملی مفاد کے لئے ایسی چیزوں کو دھونڈ کر بذریعہ اقتباسات ترجمہ یا ایڈیٹنگ شائع کرتے تھے جو یورپین حضرات کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔

اس دیباچہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے حضرت اکبر ایک ہنسے ہنسانے والے مصلح شاعر کی حیثیت سے مشہور ہونے سے قبل کس قدر سنجیدہ، دردمند اور پرجوش قومی کارکن تھے۔ سرسید اور ان کے نورتن پوری تانبا کی کے ساتھ مرکز علم و عمل علیگڑھ میں اس وقت ضوفشانی فرما رہے تھے۔ اکبر بھی ان کے درمیان موجود ہونے کی وجہ سے اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اگرچہ ان کا سرسید سے شدید نظریاتی اختلاف بھی تھا۔ لسان العصر حضرت اکبر کی زندگی کا یہ دور ان کے سوانح نگار کے لئے بہت کچھ تلاش و تحقیق کا محتاج ہے۔

شہر کے تاریخی ناولوں کا ایک جائزہ

مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے مشہور رسالہ دلگداز کے علاوہ جسکو انھوں نے پورے پچاس سال تنہا مرتب کر کے شائع کیا۔ ایک سو دو کتابیں بھی اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان کتابوں میں ۱۵ تاریخیں ۲۱ سوانح عمریاں۔ ۶ نظم و ڈراما ۱۸ متفرق کتابیں ۳۴ خیالی ناول اور ۲۸ تاریخی ناول ہیں۔ یوں تو ان کا ہر ایک مضمون اور ان کی ہر ایک کتاب ہمارے ادب کا قابل قدر سرمایہ ہے۔ لیکن ان کو شہرت دوام تاریخی ناولوں سے حاصل ہوئی گذشتہ ۱۹۵۲ء نے ہندوستان کے امن میں بلچل مچا کر زندگی کی بہت سی گذشتہ اقدار کو ختم کر دیا۔ اور مولانا شرر نے جو زمانہ دیکھا وہ مسلمانوں کے سیاسی۔ عمرانی اور علمی زوال کا زمانہ تھا ان کے دل درد مند نے محسوس کیا کہ قوم کو قعرِ مذلت و پستی سے نکالنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس میں جوش مذہبی اور ذوقِ تاریخ پیدا کیا جائے اور اسلاف کے ولولہ انگریز مذہبی و سیاسی کارناموں سے اسے گہری دلچسپی پیدا کرائی جائے تاکہ

چشم پر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را

اقبال

۱۵ العلم کراچی جنوری ۱۹۵۲ء

انہیں یقین تھا کہ اپنے بزرگوں کے حالات پڑھ کر مسلمان از سر نو ان جیسا بننے کی کوشش کریں گے اور بالآخر کامیابی و ظفر مندی ان کے قدم چومے گی۔ لیکن موضوع خشک ہونے کی بنا پر مذہبی و تاریخی کتابوں کو عوام و خواص یکساں دلچسپی کے ساتھ نہ پڑھ سکتے تھے اور اس طرح اقتضائے وقت کے لحاظ سے ان کے متعین کردہ نصب العین کو قبولیت عام حاصل نہ ہو سکتی تھی جس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ ناول و افسانہ کے ذریعہ لوگوں کو تاریخ بالخصوص تاریخ اسلام کا چسکا لگا دیں۔ ان کی یہ تدبیر بدرجہ اتم کامیاب ہوئی اور نہ صرف برصغیر پاکستان و ہند میں بلکہ دنیا کے جس جس حصہ میں اردو بولی اور پڑھی جاتی ہے مولانا نثر کے تاریخی ناول لاکھوں انسانوں کے مطالعہ میں آچکے ہیں۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں مولانا نثر کے پیدا کردہ لٹریچر کو کافی دخل ہے کیونکہ بقول اقبال سے

قوم روشن از سوادِ سرگزشت

خود شناس آمد زیادِ سرگزشت

نثر کے تمام تاریخی ناول قرون اولیٰ کے واقعات پر مبنی ہیں ان کے ناولوں میں مشرقی تہذیب جیتی جاگتی ملے گی ان کے ناول اسپین سے سندھ و قنوج تک کے حالات و واقعات اور حوادث پر حاوی ہیں۔ نثر کا حسن بین الملکتی ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے عہد کے دوسرے دو بڑے ناول نگار سرشار اور نذیر احمد سے زیادہ پر عظمت ہیں۔

صحیح تاریخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی دور کے صرف

سیاسی واقعات ہی کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ وہ اس دور کے سماجی شعور کا ہی مجموعہ ہوتی ہے۔ چنانچہ آج ہم تاریخ سے کسی عہد کے سماجی رجحانات اور ہیئت اجتماعیہ کے وجدان و شعور کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تاریخ کا مقصد محض ماضی کے واقعات کو دہرانا نہیں بلکہ مستقبل کی فکر بھی پیدا کرنا ہے۔ یہیں سے وہ زندگی کی ساکتی ہو جاتی ہے تاریخی ناول تاریخ کی اس خصوصیت کی ترجمانی کرتے ہیں جو ناول ماضی پرستی کے بجائے پرانی منزلوں ہی میں گم کر دیں افادہ می ناول نہیں کہنے جاسکتے۔ یہ بہت ہی نازک مقام ہے تاریخ حقیقت پسندی کی ترغیب دیتی ہے ناول حقیقت کو افسانے کے روپ میں پیش کرتا ہے کامیاب ناول نگار وہی ہے جو ان دونوں میں توازن قائم کر دے۔ حقیقت پرستی تاریخ کے حق میں ضروری ہے۔ لیکن ناول کے لئے نہیں اس کے برخلاف زیادہ افسانویت ہی نفس افسانہ کے لئے تو بہتر ہے لیکن بحیثیت مجموعی تاریخی ناول کے خلاف دراصل مناسب یہی ہے کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے۔ مولانا اثر کی یہی بڑی خصوصیت ہے کہ وہ تاریخ اور افسانے کے درمیان چلتے ہیں۔ دونوں میں توازن قائم رکھتے ہیں اور دونوں سے بحیثیت مجموعی برابر کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے جس انداز سے تاریخ کو پیش کیا ہے وہ غیر معمولی فنکارانہ انداز ہے۔

نثر نے اپنے تاریخی ناولوں میں ماضی کے پر عظمت نقوش کو اُسبھارا ہے۔ اخوت و مساوات اور بہادری و سرفروشی نیز حسن و عشق کی بکثرت دلپذیر روایات کو قلم بند کیا ہے یہ روایات اگرچہ اسلامی تاریخ سے وابستہ ہیں لیکن دور بین نظروں میں ان کی وقعت بن المنہی بھی ہے۔ جذبات صالح کی

عکاسی خالص انسانی زاویہ نگاہ سے کی ہے جن کا عروج و ترقی انسانیت کے مقام کو بلند کرتی ہے۔ شرر نے سچائی کے ساتھ ان جذبات کو پیش کیا ہے۔ ان کے ہیرو اور ان کے مسلم نسوانی کردار بہادر۔ مجاہد اور اصولِ مفادِ عامہ کے پیرو ہیں۔ ان کے ہر چھوٹے بڑے تاریخی ناول میں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

مولانا شرر کے تاریخی ناولوں میں ایامِ عرب۔ فلورا۔ فلورنڈہ منصور

موہنا اور فردوس بریں خاص طور پر مشہور ہیں۔

ایامِ عرب شرر کا سب سے زیادہ کامیاب ناول ہے۔ اس ناول میں انھوں نے ایامِ جاہلیت کے جیتے جاگتے نقشے کھینچے ہیں جیسا کہ ان کی کتاب ارضِ مقدس سے ظاہر ہوتا ہے۔ شرر کو رسولِ صلعم کی بعثت سے پہلے کے واقعات پر خاص طور پر عبور حاصل ہے، اس لئے ایامِ عرب میں انھوں نے ایامِ جاہلیت کے معاشرے کی تصویر بہت عمدہ کھینچی ہے۔ اس ناول کو ان کے فن کا نچوڑ کہنا چاہیے۔ اس میں ایامِ جاہلیت کی ترجمانی، اسکاٹ کی ترجمانی کے ہم پلہ ہے۔ اسکاٹ کی طرح وقت کا سماں باندھ دیا ہے۔

”فلورا فلورنڈہ“ یہ ناول بھی شرر کے تاریخی ناولوں میں ایک کامیاب

ناول ہے جس میں عیسائیوں کی اس سیاہ کاری کو بے نقاب کیا گیا ہے جو وہ مذہب کی آڑ لے کر شب و روز کیا کرتے تھے۔ ان کے معبد اور ان کی خانقاہیں ٹھیس گناہوں کا مرکز تھیں جہاں گرجے کے عہدِ سیدار و نیز امراء رنگ رلیاں منایا کرتے تھے۔ شرر نے خانقاہوں کی اندرونی زندگی کا پردہ نہایت دل آویز طریقہ پر چاک کیا ہے، اس ناول سے عہدِ نبو امیہ کی معاشرت پر بھی روشنی پڑتی ہے،

نیز اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں مسلمان راست باز وینڈر اور مذہبی خوبوں سے مالامال تھے بہرچند کہ عیسائی ان کے ماتحت تھے لیکن ان سے مساوات کا سلوک کیا جاتا اور ان کی عزت و جان کی حفاظت کی جاتی تھی فلورافلورنڈہ میں اس عہد کی اس خصوصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مسلمان دینا و حریر کا استعمال کرتے تھے اور اعلیٰ درجہ کی زندگی بسر کرتے تھے جبکہ یورپ کی زیادہ تر اقوام اعلیٰ رہن رہن کے طریقوں سے نا آشنا تھیں۔ شرر نے فلورافلورنڈہ میں تہذیب شائستگی کے وہ تمام نقوش اُجاگر کئے ہیں جنکا ثبوت ہرمورخ کے یہاں ملتا ہے۔ شرر اس ناول میں اکثر ادبی رومانی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں خصوصیت سے وہ مناظر جہاں یولاجیس کی فریب کاریوں کو منظر عام پر لایا گیا ہے بہت دلچسپ اور پراثر ہیں

”منصور مومنا“ شرر کا یہ ناول ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء سے شروع ہوتا ہے

اس میں سلطان محمود غزنوی کی فتوحات سے افسانے کو وابستہ کیا گیا ہے لیکن وہ بس انہی حد تک تاریخی ہے کہ اس میں افسانے کا آغاز و انجام سلطان محمود کے ہندوستان پر حملہ کے زمانے سے متعلق ہے۔ اس کا مرکزی خیال محمود کے حملوں کو بیان کرنا اور اسلامی عظمت کو منظر عام پر لانا ہے۔ افسانہ منصور مومنا اور عنذرا کی محبت کے گرد گھومتا ہے لیکن اس کی شان نزول کس قدر بچان ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی اس افسانے میں کافی غلطیاں ہیں۔ مثلاً محمود کے حملے کے زمانہ میں اجمیر کسی نمایاں اہمیت کا مالک نہ تھا۔ حالانکہ ناول نگار نے اجمیر کو ہی خاص جگہ دی ہے ہندوستان میں اس وقت بہت سی ہندو ریاستیں تھیں۔ دریائے سندھ کے قریب گندھارا میں برہمنوں کی حکومت تھی۔ قنوج

اور وہی میں تو ماروں کا راجہ تھا۔ گنگا کے نشیبی میدانوں میں گدھ کے بدھ حکمراں تھے مالوا میں گیتا اور مہو بہ میں چندیلے تھے۔ ہندوستان میں محمود کو تین لڑائیاں خصوصیت سے لڑانی پڑی تھیں پہلی لڑائی جے پال سے دوسری قنوج کی اور تیسری سومنا تھ کی شہر نے ناول میں جو وقت متعین کیا ہے یعنی ۱۰۱۶ء یا ۱۰۱۷ء جو قنوج پر حملے کا وقت ہے ۱۰۱۸ء میں محمود نے تو مارا راجہ کے دارالسلطنت قنوج پر حملہ کیا اور مختلف ضمنی لڑائیاں لڑنے کے بعد راہیب یارام گنگا کے کنارے ۱۰۲۰ء میں تو مارا حکومت کا مکمل استیصال کر دیا۔ دسمبر ۱۰۱۸ء کے پہلے ہفتے میں محمود نے متھرا فتح کیا۔ اس کے بعد وہ قنوج کی طرف بڑھا تھا۔ مولانا شہر نے جن گھمسان کی لڑائیوں کے نقشے کھینچے ہیں، وہ بے بنیاد ہیں۔ جیسا کہ لین پول نے لکھا ہے، عالم یہ تھا کہ راجہ سلطان کے آنے کی خبر پا کر ہی فرار ہو گیا اور گنگا کے کنارے اس بڑے شہر کے سات قلعے ایک ہی دن میں ختم ہو گئے۔ گھمسان کی لڑائیاں ۱۰۱۸ء سے پہلے اور ۱۰۱۸ء کے بعد ہوئی ہیں۔ لہذا ۱۰۱۶ء کے وقت کا انتخاب تاریخی نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ البتہ اسلام کی شان اجاگر کرنے اور محبت کی ہمہ گیری ثابت کرنے میں یہ ناول بہت کامیاب ہوا ہے۔

یہ ناول المیہ پر ختم ہوا ہے۔ تاریخی ناول کا المیہ انتہائی پُر اثر ہوتا ہے کیونکہ المیے میں زوال ایک عظیم زوال ہوتا ہے۔ اگرچہ منصور کوئی تاریخی شخصیت نہیں ہے لیکن افسانے نے اس کو کافی بلند کر دیا ہے۔ اور اس کا زوال خاصا اثر انگیز ہے۔

فردوس بمیں۔ اس ناول میں شہر نے رومان کا ہلکا سا سہا لے کر

حسن بن صباح کے فرقہ باطنیہ جو حشیشین کے نام سے مشہور ہے کی کارگزاریوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس ناول میں محبت کی چاشنی کم ہے بلکہ شر نے اپنا پورا زور قلم فدائیوں کی خفیہ کارروائیاں بیان کرنے میں صرف کیا ہے۔ علاوہ انہیں ان کے تیشی خا کے جو فردوس بریں اور قلعہ الموت سے متعلق ہیں جاندار اور اثر پذیر ہیں۔ یہ ناول ایک تاریخی حقیقت پر قائم ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس میں کافی پذیرائی ہے۔ شر نے فدائیوں کے ہاتھوں جو قتل دکھائے ہیں وہ گیارہویں صدی عیسوی کے دہشت ناک دور کی اسی نوعیت کی دوسری زبردست اموات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ فدائیوں نے خواجہ حسن نظام الملک کو مارنے کا قصد کیا تو اسکو مار کر ہی دم لیا۔ ان کے ہاتھ سے ہسکل ہی سے کوئی بچا تاریخ شاہد ہے کہ کیسی کیسی الوالعزم عظیم الشان شخصیتیں ان کے خنجر کا شکار ہوئیں۔ فردوس بریں میں صاحب الموت کی سیاہ کاریوں اور قلعہ الموت کی معصیت میں لپٹی ہوئی زندگی کا نقشہ بھی حد درجہ پراثر ہے۔ چونکہ مولانا شمس کا وہن مذہب کی جانب زیادہ راغب تھا اس لئے دین اور بے دینی کی بھی کافی معلوماتی بحثیں فردوس بریں میں ملتی ہیں۔ باطنی فرقے کے عقائد اور ان کی منطقی وسیلین جس عہدگی کے ساتھ ناول میں بیان کی گئی ہیں دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ حالانکہ فردوس بریں ایک تاریخی ناول ہے مناظرہ کی کتاب نہیں۔

مذکورہ ناولوں کے علاوہ شر کے دوسرے تاریخی ناول ملکہ نوبیہ و شہسپ فلپاتا۔ ملک العزیز ورجنا۔ حسن بن صباح۔ مینا بازار۔ قیس ولبنی۔ ماہ ملک شوقین ملکہ۔ فتح اندلس۔ عزیزہ۔ زوال بغداد۔ جو یائے حق۔ باجک خسری۔

مفتوح فاتح۔ الفانسور و مہ الکبریٰ و لعبت چین، یوسف نجر۔ مقدس نازنین۔ اور حسن انجیلینا سب کی سب کم و بیش عمدہ اور یادگار زمانہ کتابیں ہیں تاریخ اپنے سینہ میں بعض ایسے حسین ترین واقعات چھپائے ہے جو حقیقت پر مبنی ہیں اور ساتھ کے ساتھ رومان سے بھی لبریز ہیں۔ شہر نے ان کو ناول سے وابستہ کر کے اور افسانے کے رنگ میں پیش کر کے ان کی دل کشی میں چارچاند لگا دئے۔ وہ اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے انہوں نے باضابطہ ناول نگاری اور وہ بھی تاریخی ناول نگاری کی ابتدا کی ہے۔ اردو داں طبقہ میں وہ بہت مقبول ہیں اور ان کو عام عزت حاصل ہے۔ کیونکہ مذہبی و تاریخی ادب کو عوامی بنانے میں انہوں نے مدت العمر غیر معمولی کوشش کی خصوصیت سے منصور موہنا اور ایام عرب خالص عوامی چیزیں ہیں۔ انہوں نے اپنے تاریخی ناولوں کے ذریعہ عوام تک اسلام کی عظمت کے قصبے پہنچائے۔ شہر اسلام کے رجز خواں ہیں اور یہی ان کے ناولوں کا اولین مقصد ہے۔

(ہشکرٹہ ریڈیو پاکستان)

تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت

(تالیف: مولانا سید ہاشمی فرید آبادی)

پاکستان بننے کے کئی سال بعد تک ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ کی پرانی کتابیں ہی پڑھائی جاتی رہیں۔ ایک ایسی تاریخ جو خصوصی طور پر پاکستان کے جغرافیائی حدود اور وجود پر بھی روشنی ڈالتی ہو موجود نہ تھی جناب مولانا ہاشمی فرید آبادی نے اس کمی کو پورا کیا اور ”مسلمانانِ پاکستان و بھارت“ کی تاریخ کو اس نہج پر ترتیب دے دیا کہ پاکستان کی تاریخ صاف طور پر عیدہ نظر آنے لگی، واقعات سب پرانے ہیں صرف ترتیب میں مفید چابکدستی سے کام لیا گیا ہے۔

ہاشمی صاحب نے دوسرا اچھا کام یہ کیا کہ اپنی کتاب کو شخص جنگی وقائع اور بادشاہوں کے زرمیہ کارناموں تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ خاتمہ البواب میں عہدِ بعہد کی علمی تعلیمی اور تہذیبی ترقیوں کو بھی موثر انداز میں اجاگر کرتے چلے گئے۔ جن کا مطالعہ تاریخ کے طالب علموں، پاکستانی قوم اور اس کے حاکموں کے لئے از بس ضروری تھا۔

چونکہ فی الوقت پاکستان میں علمی و ثقافتی سرگرمیاں اور ان کی خاطر خواہ قدر والی نظر انداز ہے اور صاحبانِ علم و فن کا ستارہ گردش میں ہے لہذا

محض اس امر کی ترغیب اور یاد دہانی کے لئے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ اور ہر حال میں حکمرانی و معارف پروری کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔.....
 ہاشمی صاحب کی تاریخ کو پڑھتے وقت ہم ان حصوں پر نشان کرتے گئے جو ثقافتی جدوجہد سے متعلق تھے ان نشان زدہ حصوں کا جب ہم نے یکجائی مطالعہ کیا تو عہد اسلامی کی علمی ترقیوں کی ایک مکمل تصویر آنکھوں میں پھر گئی، اپنی اس پسندیدہ تصویر کو ہم بجنسہ ناظرین "العلم" کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں تاکہ ماضی کی اس شاندار یادگار کو حال و مستقبل کے لئے نشان راہ بنایا جاسکے۔

متفرق مضامین کو مربوط کرنے کے لئے ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں اور چند سطروں کا بچھڑ خفی اضافہ کیا گیا ہے اور جو مقام محل نظر تھے ان کو حوالوں کے ساتھ حل کر دیا ہے۔

الغرض ہاشمی صاحب کی "تھوک کی کوٹھی" سے "خروہ کی یہ دوکان" اچھی خاصی سبج گئی ہے کاشت اسے خریدار بھی پسند کریں۔



علی گڑھ میگزین (علی گڑھ نمبر)

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

علی گڑھ میگزین کا زیر نظر نمبر اس کے خصوصی شمارے کی حیثیت سے خاص اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے پرچے کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جزو اول کا عنوان "علی گڑھ تحریک" ہے اور جزو دوم "شخصیات اور جائزوں" کے لئے مختص کیا گیا ہے اور یہ سارا مواد میگزین کے مخصوص سامرے پر کوئی ساڑھے تین سو صفحات میں سما گیا ہے۔

اپنے دور رس اثرات اور ہمہ گیر حلقہ اثر کے لحاظ سے علی گڑھ تحریک اس برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ میں ممتاز ترین مقام کی حامل ہے اور گزشتہ ایک صدی کے سیاسی، معاشرتی و تعلیمی ارتقا کا کوئی جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاسکتا جب تک علی گڑھ تحریک کی حقیقت اور اس کے اثرات مابعد کا تفصیلی مطالعہ پیش نہ کیا جائے۔

حالی نے حیات جاوید میں سرسید کی سیرت اور ان کے کردار کا نقشہ کھینچتے ہوئے انہیں ایک جامع حیثیات، شخص کہا ہے۔ حالی کے زمانے تک اور حیات جاوید کی تدوین کے وقت سرسید کی ہمہ جہتی شخصیت کے مختلف

پہلوؤں کا عام احساس شروع نہیں ہوا تھا لیکن اہل نظر اس ذہنی انقلاب کے ابتدائی نقوش سے بے خبر نہ تھے جو سرستیدا احمد خاں کی تحریک کے نتیجے میں رونما ہونے والا تھا چنانچہ حیات جاوید میں انیسویں صدی کے اس عظیم انسان کی سیرت کے سارے خدو خال تفصیل کے ساتھ پیش کر دیے گئے ہیں۔ اور اب ان پر کسی قسم کا اضافہ بہت مشکل ہے۔ بایں ہمہ تحقیق و تفتیش اور اخذ نتائج کا دروازہ کھلا ہوا ہے، علیگڑھ میگزین کے ادارے نے اس تحریک کے مختلف پہلوؤں کو از سر نو پیش کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس کوشش کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیم کے بعد کے دور میں سرحد کے اس پار (دشمنوں نے ہی نہیں بعض دوستوں نے بھی)۔ سرستیدا وسان کی پالیسی کی ترجمانی کچھ اس انداز پر کی جو حقیقت سے بے حاصل دور تھی۔ سرستیدا کی دیانت، ان کی وطن پرستی اور سیاسی مسلک پر شک شبہ کا اظہار کیا گیا۔ علیگڑھ میگزین کا یہ پرچہ ان شکوک و شبہات کو دور کرنے میں کامیاب ہوا تو یہ ایک خوش آئند بات ہوگی۔



اس نمبر کے لکھنے والوں میں بیشتر بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ زیادہ تر علیگڑھ کے بارے میں عام خیالات اور سطحی باتوں کو دہرا دیا گیا ہے۔ بیشتر مضامین "فرمائشی" نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں جن میں عالمانہ غور و فکر سے کام لینے کی بجائے کہی ہوئی باتوں کو نئے انداز میں بیان کرنے پر اکتفا کر لیا گیا ہے۔ ہمارے ممتاز ادیبوں اور نامور ماہل قلم کا یہ

رو یہ ان کے اپنے لئے بھی کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ تاریخی شہادتوں اور متعلقہ مواد سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا۔ یہاں پاکستان میں علیگڑھ پر کام کرنے والوں کے لئے بڑی دقت یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق جملہ مواد ہندوستانی کتب خانوں بالخصوص علیگڑھ میں رہ گیا ہے اور وہاں جا کر کام کرنے کے لئے جس پر سکون فضا اور دلجمعی کی شرط ہے وہ بین المللکی تعلقات میں اب تک صحیح معنوں میں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ دونوں ممالک کے طالب علموں بالخصوص تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے سرکاری سطح پر اس قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔ دریں اثنا علیگڑھ سے شائع ہونے والے پرچے سے جہاں اس موضوع پر کام کرنے کے لئے ہر ممکن مواد اور سہولتیں حاصل ہیں ایک دوسرے کی چیز کی اشاعت کی توقع نہیں کی جا سکتی ہمیں افسوس ہے کہ ان سہولتوں سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

سب سے پہلی بات جو اس سلسلہ میں کھٹکتی ہے وہ ایک باقاعدہ خاکہ کا فقدان ہے۔ سرسید کی زندگی اور ان کے کاموں کو مختلف ابواب میں تقسیم کر دینا چاہیے تھا۔ اور یہ باب مختلف حضرات میں ان کی دل چسپی اور رجحان کے مطابق تقسیم کر دیئے جاتے۔ ادارتی عملہ ان میں ضروری کمی بیشی کر کے تسلسل پیدا کر دیتا تو پورے پرچے میں موضوع و بیان کے ارتقا کی صورت پیدا ہو جاتی فی الوقت مختلف اور منتشر موضوعات پر مضامین فراہم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پورا میگزین پڑھ لینے کے بعد بھی ہم کسی مرکزی تصور تک پہنچنے

سے قاصر رہتے ہیں۔ بعض عنوان ایسی عام نوعیت کے ہیں کہ ان میں سید احمد خاں کے رجحانات کا مجموعی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ بعض موضوعات پر ایک سے زیادہ حضرات نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے، چنانچہ یا تو ایک ہی بات کئی کئی جگہ بیان ہو گئی ہے یا پھر اس کی بالکل متضاد و مختلف توجیہات کی گئی ہیں جن سے ذہن کو الجھن ہوتی ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عملہ ادارت نے بجز فراہمی و طباعت مضامین کے اور کسی طرف توجہ نہیں دی ورنہ مکررات کو بہ آسانی حذف کیا جاسکتا تھا اور درمیانی کڑیوں کا خلا پر کرنے کے لئے مقامی طور پر مضامین لکھے یا لکھوائے جاسکتے تھے۔

علیگڑھ کی سیاسی زندگی پر ڈاکٹر محمد اشرف صاحب کا مضمون خاص طور پر لائق توجہ ہے سید احمد خاں کے کارناموں کو راجہ رام موہن رائے کی سرگرمیوں کا مسلم ایڈیشن قرار دے کر موصوف نے ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے لیکن ہم امید کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب اس خیال کو ایک مستقل مقالے کی صورت میں ذرا پھیلا کر پیش کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ بنگالے سے سماجی اصلاح کی جو تحریک اٹھی تھی اس نے انہیں کس طور پر اور کن ذرائع سے متاثر کیا "دل و دماغ" کی جس کشمکش کا ذکر موصوف نے علیگڑھ کی سیاسی زندگی کے سلسلہ میں کیا ہے وہ دراصل ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جو مر سید کے ذہن کے ارتقا کی تبدیلیوں کا عہد بعہد مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب اس طرف توجہ فرمائیں کہ مرسیڈ نے آخر میں علیگڑھ کو جس راستے پر ڈالا تھا اس کے انتخاب میں بڑی حد تک وہ گروپس کے حالات سے مجبور ہوئے تھے ورنہ ابتداء میں وہ خود ہندو مسلمان دونوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے کے قابل تھے یہ موضوع تفصیلی بحث کا محتاج ہے مگر افسوس ہے کہ میگزین کے صفحات میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں نکالی گئی۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب سے بمشکل اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ علیگڑھ کی "سیاسی بیداری" کی تاریخ لکھنے پر آج تک سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ ہم علیگڑھ میگزین کے ارباب حل و عقد کو اس ضرورت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ میگزین کا آئندہ شمارہ اسی موضوع کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے علیگڑھ کے حالات کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنی ناواقفیت کا اعتراف کر لیا ہے اور چونکہ اس زمانہ میں ان کا دل و دماغ کانگریس کی تحریک رابطہ عوام کی کامیابی کے لئے وقف تھا اس لئے وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس دور کا مسلم ہندوستان اکثریت کے جارحانہ (بلکہ جابرانہ) طرز عمل کی بدولت اپنے سیاسی مستقبل سے کس درجہ مایوس ہو چکا تھا اور علیگڑھ نے اس دور میں مسلمانوں کے سچے اور بے لاگ ترجمان کی خدمت انجام دی ہے اس کے برعکس یہ کہنا کہ بیزاری اور تلخی کا یہ سرچشمہ علیگڑھ سے پھوٹا۔ واقعات و حقائق کے مسخ کر دینے کے مترادف ہو گا۔ علیگڑھ تو اس کا متاد اور ترجمان تھا اور بس۔ اسکی ذمہ داری جس گروہ پر ہے ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں پھیلنے والی اس کا اظہار خطرے

سے خالی نہیں۔ بہر طور ڈاکٹر صاحب کا مضمون اپنی بعض انتہا پسندانہ آرا کے باوجود دعوتِ فکر دیتا ہے۔ پاکستانی رجحانات کے سلسلے میں "شاہنامہ اسلام" کی مقبولیت اور مولوی ہاشمی فرید آبادی صاحب کی تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت کے عنوان "کشور کشائی" پر تعریفیں ڈاکٹر صاحب کی موجودہ سیاست کے عین مطابق ہے۔ ہندوستان میں پراچین کال کے تمدن کو اپنانے اور اس پر فخر کرنے کے عام رجحان کو ڈاکٹر صاحب بہ آسانی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ لیکن پاکستان کی تاریخ کا منطقی سلسلہ اگر شاہانِ و سلاطینِ دہلی سے ملایا جاتا ہے تو سرگرائی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ علیگڑھ تحریک کا اصلی دھارا تقسیم کے بعد فطری طور پر پاکستان منتقل ہو گیا ہے۔ نئے علیگڑھ کی صورت میں اس کے بقا و استحکام کی کوشش کی جائے تو اس پر خفا ہونے کا کوئی محل نہیں ہے۔

سر سید کے مذہبی طرزِ فکر کا ہمارے محترم دوست عمر الدین صاحب صد شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی نے جو تجزیہ کیا ہے وہ اس پرچہ کا نہایت وقیع مضمون ہے اور حق یہ ہے کہ موصوف نے اپنے موضوع کا بڑی کاوش سے جائزہ لیا ہے۔ مغرب کے تہذیبی اور ادبی اثرات پر آل احمد سرور صاحب نے بعض نئی باتیں کہی ہیں جن سے اختلاف بھی ممکن ہے مثلاً وہ سید احمد خاں کو مفکروں میں جگہ نہیں دے سکتے بلکہ انھیں محض ایک مبلغ سمجھتے ہیں۔ اردو نثر کی جو خدمت سر سید نے کی ہے۔ سرور صاحب نے مناسب الفاظ میں اسے خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

افسوس ہے کہ شخصیات کا حصہ جو اردو زبان میں دل چسپ کاغذ آمد اور معلومات افزا ہو سکتا تھا نسبتاً ہلکا نظر آتا ہے۔ اس فہرست میں ان تمام فرزند ان جامعہ کا ذکر آنا ضروری تھا جن کی فکر و نظر نے صرف علیگڑھ اور اس کی پالیسی بلکہ پورے برعظیم کے مسلمانوں کی ذہنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ اس فہرست میں ادیبوں کی کثرت نظر آرہی ہے، ادب کے گہرے اثرات اور ادیب کی خاموش ذہنی گرفت کے وزن کو کم کرنا مقصود نہیں لیکن اس ادارے کی خاک سے جو لالہ و گل پیدا ہوئے ان کی خوشبو اور رنگینی زندگی کے دوسرے میدانوں پر بھی محیط تھی۔ اس فہرست میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مہاراجہ محمود آباد، نواب سر محمد مراد اللہ خاں، سر شاہ محمد سلیمان، نواب صدربار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا سید طفیل احمد، سر اس مسعود اور بالخصوص ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی عدم موجودگی بڑی طرح محسوس ہوتی ہے، ادارتی شذریے میں استاذی پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کی نگرانی کے باوجود زبان و بیان کی خامیاں افسوسناک ہیں۔

بہر حال ادارے کی یہ کوشش قابل قدر ہے بالخصوص جن حالات میں یہ پرچہ نکالا گیا ہے اس کے پیش نظر اسے غنیمت ہی سمجھنا چاہیے۔

رہبر نسواں

تصنیف : قاضی عابد علی بلہوری

قیام پاکستان کے داعیات میں ایک بڑا بلکہ سب سے بڑا داعیہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے قومی وطن میں اسلامی معاشرہ کی آزادانہ تشکیل کریں گے۔ اس تشکیل کے لئے جہاں اور چیزوں کی ضرورت ہے وہاں تعلیم و تعلقہ کا صحیح نہج مقرر کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے۔ جب تک بچوں، اور بچیوں کی تعلیم کا صحیح نہج مقرر نہ کیا جائے گا اور اسلامی نقطہ نظر اور اسلامی سیرت و کردار کی تعمیر کا صحیح انتظام نہ ہوگا اس وقت تک معاشرہ کی صحت و صلاحیت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اسلام جدید و قدیم کی قیود کو تسلیم نہیں کرتا۔ مسلمان کا اصول عمل ہمیشہ ”خدا عفا وذرع ما کدر“ ہونا چاہیے۔ مگر تجدد پسندی اور جنت طرازی کو وقت کا فیشن سمجھ کر اس کے سامنے معذرتی انداز میں جھک جانا اور اپنی قیمتی روایات کے سرہانہ کو خنزیرینے قرار دے کر دانش و بینش کے افلاس کا مظاہرہ کرنا ایسی بات ہے۔ جسے کوئی غیر متد اور صاحب بصیرت انسان پسند نہیں کر سکتا۔ لیکن افسوس کہ آج پاکستان میں ملوٹا اور کراچی میں خصوصاً جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہی ہے۔

یہاں اونچے ایوانوں سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی جھونپڑی تک میں ایک ہی قسم کی ہوا چل رہی ہے اور ہر کہہ و مہر اسی کے رخ پر اڑنے کو ذریعہ عزت و کامیابی اور اپنی روایات کی تغلیط و غیر اسلام کی تقلید کو سرمایہ افتخار قرار دے رہا ہے۔ ماحول کی یہ قیامت خیزیاں ہمارے بچوں اور بچیوں کی سیر و کردار کی تشکیل کے لئے جیسی کچھ سم قاتل ہیں اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ ان کے اثرات محسوس و غیر محسوس اور شعوری و غیر شعوری ہر اعتبار سے بہت گہرے پڑے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اول تو تدارک و انسداد کا کوئی خاص انتظام نہیں اور اگر تعلیم گاہوں میں کچھ ہے بھی تو بڑی حد تک ناقص و ناکافی یہ صورت حال بڑی تشویشناک بلکہ خطرناک ہے۔ ارباب حکومت، اہل علم و بصیرت اور یہی خواہان ملک و ملت پر لازم ہے کہ اس کے تدارک و انسداد پر متوجہ ہوں۔ اور جو برائیاں معاشرہ کی جڑوں کو کھول کر رہی ہیں انھیں دور کرنے کا جلد از جلد انتظام کریں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ مشہور صحافی جناب قاضی عابد علی صاحب بلہوری نے اس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر خشت اول کے طور پر اپنے دائرہ فکر و عمل میں اس کام کی مبارک بنیاد رکھی ہے اور بچیوں کی تعلیم کے سلسلہ کی ایک اہم ضرورت کو ”رہبر نسواں“ کے نام سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب ایک مسلسل دلچسپ قصہ پر مشتمل ہے جو خالص اسلامی و مشرقی انداز میں لکھی گئی ہے۔ زبان صاف ستھری بیگماتی اور اندازاً اتنا سنگتہ و دل نشین ہے کہ آنکھوں کے سامنے ایک سچے با وضوح مسلمان گھومتے

ایک اسلامی درس گاہ اور ایک ایسے تربیتی ادارہ کا نقشہ پھر جاتا ہے جو ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتا ہے اور جسے بڑی حد تک اسلامی معاشرتی ورثہ کی بازیافت کا وسیلہ کہا جاسکتا ہے۔

قصہ کے پہلے باب میں مولوی عماد الدین کی زبان سے لڑکیوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی ضرورت کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

”بچپن میں لڑکیوں کو جیسا چاہو ویسا بنایا جاسکتا ہے۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت اچھی ہو گئی تو اچھی بن جائیں گی، بری باتوں میں پڑیں گی، تو بری ہو جائیں گی۔ جیسے چھوٹے چھوٹے پودوں کو باغبان جہاں چاہے اکھاڑ کر لگا سکتا ہے، اگر جھکانا چاہے تو جھکا سکتا ہے۔ سیدھا کرنا چاہے تو سیدھا کر سکتا ہے۔ مگر جب وہ درخت بن جاتا ہے اور سخت ہو جاتا ہے تو اسے نہ سیدھا کیا جاسکتا ہے نہ ٹیڑھا۔ سیدھا ہو گیا ہے تو سیدھا ہی رہے گا اور ٹیڑھا ہو گیا ہے تو ٹیڑھا،“

بچوں اور بچیوں کی نفسیات کو اس پیرایہ میں بیان کرنے کے بعد صحیح تعلیم و تربیت کی بنیادی باتیں سکھائی گئی ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ ہماری بچیوں کی تعلیم و تربیت کا آغاز کس طرح ہونا چاہیے۔ اس میں کن باتوں کی ضرورت ہے اور کن باتوں سے اجتناب لازم ہے۔ علم دین، امور خانہ داری اور بڑے چھوٹوں کے ادب و لحاظ سے صحت و صفائی تک اٹھ البواب قائم کر کے انھیں گہرے بے بہا سے اس طرح مزین کیا گیا ہے کہ ہر صنف بلکہ ہر سطر ”کرشمہ وامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

کے مصداق بن گئی ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ کتاب قبولِ عامہ کی سند حاصل کرے گی، اور مصنف
موصوف اس کتاب کے باقی حصے بھی زیورِ طبع سے آراستہ کر کے منصفہ شہرِ روپ
لائس گے۔ توقع ہے کہ یہ حصے ندریجا بڑے درجوں کی طالبات کی علمی و
ذہنی، اخلاقی، مذہبی اور دیگر متعلقہ ضرورتوں کی تکمیل کو باحسن الوجوہ پورا
کریں گے۔

ہندوؤں کی تعلیم

مسلمانوں کے عہد میں

تصنیف: علامہ سید سلیمان ندوی

جس طرح افراد کے مزاج و عادات اور جبلی تقاضے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اقوام کے عادات و خصائص میں بھی باہم اختلاف پایا جاتا ہے اس کے اسباب علمائے حیاتیات و نسلیات کے نزدیک کچھ ہی ہوں اور آب و ہوا یا وسائلِ حیات وغیرہ کے موثرات کا کیسا ہی دخل ثابت کیا جائے مگر قوموں کی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ موثر و کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ ان کے فکر و نظر کا وہ انفرادی انداز ہے جس سے فرد جماعت کی زندگی کی جملہ خصوصیتیں تشکیل پاتی اور جبلتوں اور عادتوں کا رنگ اختیار کر کے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔

اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو قدیم ہندوستان کے ہندو اپنی بعض خصوصیتوں میں دنیا کی تمام دوسری قوموں سے مختلف نظر آتے ہیں، اوہام و اباطیل پرستی کی عہد مشترک کو چھوڑ کر اس زمانہ کی "متمدن" قوموں سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں۔ ذات پات کی تقسیم نے اجتماعی زندگی کو محدود ترین دائروں میں اس طرح

تقسیم کر رکھا تھا کہ کسی کو ایک دائرہ سے نکل کر کسی دوسرے دائرہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ ایک دائرہ دھرم رکھشکون اور مذہبی سرداروں کا تھا جو پیدائشی اور نسلی برہمنوں کے لئے مخصوص تھا دوسرا جنگ آزماؤں اور سرداروں کا جس میں صرف چھتری رہ سکتے تھے۔ تیسرا ویشیوں کا تھا جو کھیتی باڑی اور تجارت کے ذریعہ لوگوں کو ضروریات زندگی فراہم کرتے تھے۔ اور چوتھا شودروں کا اور چندالوں کا تھا جنہیں حیوانوں سے بھی فروتر درجہ دیا گیا تھا اور جن کا جان و مال ہر وقت اور ہر حال میں اعلیٰ ذات والوں کے لئے مباح تھا۔ سفر و سیاحت اور دوسری قوموں سے ربط و تعلق کو برا خیال کیا جاتا تھا۔ اور یہ عقیدہ عام تھا کہ سمندر کا سفر کرنے سے دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ تعلیم صرف برہمنوں کے لئے مخصوص تھی اور حکم تھا کہ اگر تپنج ذات کا کوئی آدمی اتفاق سے بھی وید کا اشلوک سُن لے تو اس کے کانوں میں گھنٹا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے

یہ تھا قدیم ہندوستان کے باشندوں کا طریق فکر و نظام حیات جس کا کوئی جزو ایسا نہ تھا جس پر علیحدگی پسندی و بے تعلقی اور تعصب و تنگ نظری کی مہر ثبت نہ ہو علم کی حد بندی، مجد و شرف کی اجارہ داری اور دوسری قوموں سے بے تعلقی و بے نیازی ہی کا کرشمہ ہے کہ عہد پارنیہ کا ہندوستان علمی سرمایہ سے یکسر تہی و امن ہے اور ہزاروں سال کی متمدن زندگی کے وعادی کے باوجود کوئی ایک کتاب یا کوئی دوسرا بیکار ڈالیا پیش نہیں کر سکتا جس سے اس زمانہ کی اجتماعی زندگی کی ترقی کا کوئی ثبوت بہم پہنچ سکے اگر کچھ ہے تو دیو مالائی بے مہر پانچ قصے کہانیاں یا لے دے کر ایک رامائن ہے جو خود اسی قسم کی غیر عقلی داستان

سراٹھیوں پر مشتمل ہے۔ پھر یہ صورت حال عہدِ قدیم کے اوائل و اواسط ہی سے مخصوص نہیں، اواخر میں بھی پوری نمایاں ملتی ہے، قبل از تاریخ سے مابعد تاریخ تک کے ہر ماخذ پر نظر ڈال جائیے۔ علم کی اشاعت اور تعلیم کے کسی نظام کا کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔ کالنگا، پاٹلی پتر اور ہٹھاپاٹکسلا ہندو ازم کے نہیں بدھ مت کے فروغ کے آثار میں شامل ہیں۔ چنانچہ جب بدھ و مہرہ کو زوال اور برہمنیت کو دوبارہ فروغ ہوا تو تعلیم و تعلم کے یہ مرکز بھی عصبیت جاہلیہ کی نذر ہو گئے۔ ایک طرف ہندو قوم کا یہ رنگ تھا دوسری طرف باویہ نشینانِ عرب ایشیا و یورپ کے درمیان ربط و اتصال کے وسیلہ بنے ہوئے تھے، یوں تجارت تو زمانہ قبل از اسلام سے جاری تھی مگر جب اسلام سے مشرف ہو کر اہل عالم کی ہدایت و رہبری پر مامور ہوئے تو سرتاسر زندگی کی برکتوں اور سعادتوں کا، سرچشمہ بن گئے ان کے قدم جہاں پہنچے جاہلیت کی نحوستیں دور ہوئیں اور دیگر قوموں نے ظلم و جور سے نجات پائی۔

ہندوستان کے مسلم عہد کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کے دم قدم سے یہاں تمدن و معاشرتِ فکر و فہم اور علوم و فنون میں ایسا انقلاب آیا کہ ایک طرف جو لوگ جامہ دوزی کے فن اور ضرورت تک سے ناواقف تھے، وہ آدابِ معاشرت میں مسلمانوں کے ہمدوش بنے تو دوسری طرف علم و فن کے علمبردار مسلمانوں نے بے تعصبی و مساوات اور علوم و فنون کی ترقی کے میدان میں سعی و ہمت کا وہ نمونہ اور حسن سلوک اور رفیق مدارات کا وہ معیار قائم کیا کہ راعی و رعایا میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ ہندوؤں کو انہوں نے ہر میدان میں آگے بڑھایا۔ تحصیل علم اور ترقی

فنون کا ذوق پیدا کیا اور سرپرستی و سربراہی کی ایسی راہیں نکالیں کہ عروج و کمال کی کوئی منزل ایسی نہ رہی جو بلند حوصلہ شخص کی زد سے باہر ہو۔ یہ داستان اتنی طویل ہو کر اس کا استیعاب کسی ایک صحبت یا کسی کتاب کے محدود صفحات میں ممکن نہیں تاہم علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے اس کے ایک عنوان ”ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں“ پر کاوش و تحقیق کے جو نتائج پیش کئے ہیں ان سے اس گلشن الطاف و احسان کی بہار کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے :-

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

”ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں“ حضرت علامہ مرحوم کا ایک علمی مقالہ ہے جو انہوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کلکتہ منعقدہ ۱۹۱۵ء میں پڑھا تھا۔ اس کے پایہ تحقیق و استناد کے متعلق مجھ جیسے پیچیدان کا کچھ کہنا سوریج کو چراغ دکھاتا ہے البتہ اس موقع پر میں ایک اشارہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ ایک طرف مسلمانوں کے عہد اقتدار کی یہ خصوصیتیں اور ہندوؤں پر ان کے یہ احسانات ہیں، دوسری طرف ہندوؤں کی یہ احسان فراموشی و محسن دشمنی کہ آزاد و صاحب اختیار ہونے سے پہلے ہی مسلم کشی پر کمر بستہ ہو گئے اور ایک ہزار سال کے حسن سلوک کو یک قلم فراموش کر کے ان کے مذہب و تمدن ہی کو نہیں مشترکہ تہذیب کے آثار و مظاہر تک کو مٹانے پر تلی گئے۔ قومی مزاج و قماش کی اس کیفیت کو وقت کی چلتی ہوئی اصلاحات کے آئینہ میں دیکھنے کی کیسی ہی کوشش کی جائے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ان کی قومی خصوصیت ہے اور محسن کشی و احسان فراموشی ان کا مایہ خیمہ آج

کے حالات میں قومی مزاج و خصائص کا یہ تقابلی مطالعہ جہاں تاریخی لحاظ سے مفید و دل چسپ ہے وہاں سیاسی اور واقعاتی اعتبار سے بھی عبرت انگیز و سبق آموز ہے۔

اللہ تعالیٰ علامہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین!



جمہوریت اور تعلیم

(جلد اول و دوم)

مصنفہ: جان ڈیوی * مترجمہ: تیر محمد تمقی

اردو زبان میں تلخیص و تراجم کا دور دورہ ڈیڑھ سو سال قبل شروع ہوا تھا۔ یعنی جوں ہی اردو میں باقاعدہ نثر نگاری کی ابتدا ہوئی سب سے پہلے دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کی طرف توجہ کی گئی۔ اس کا سبب ظاہری یہ تھا کہ اردو نسبتاً ایک نوجو زبان ہے، اگرچہ اس کا ابتدائی سراغ سات آٹھ سو سال قبل ملتا ہے۔ جس کی نشاندہی اور صراحت اردو کے نشو و ارتقا کے فاضل محققین نے تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ بحیثیت ایک علمی زبان کے اس کی عمر بہر حال پونے دو سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اردو زبان میں تراجم کی غیر معمولی اہمیت کا سبب یہ ہے کہ جب انیسویں صدی کے آغاز میں اردو کو ایک سرکاری اور بین الصوبائی زبان کی حیثیت سے اختیار کیا گیا تو الیسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے (جس نے فارسی کے بجائے اردو کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا) محسوس کیا کہ جب تک وسیع پیمانے پر ترجمے کی تحریک نہ چلائی جائے گی ممکن نہیں کہ اردو کو حکومت اور کاروبار حکومت کی عملی اغراض کے لئے پھر پورا اور ہمہ گیر طور پر استعمال کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلا قدم کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کے «دارالانشاء» کی شکل میں اٹھایا گیا۔ اور ڈاکٹر

جان گلکراٹسٹ نے اردو کے نامور اور ممتاز ادیبوں کو جمع کر کے اپنی نگرانی میں اردو کی چند یادگار کتابیں تالیف اور تصنیف کرائیں جن زبانوں کو تراجم کے لئے چنا گیا تھا ان میں انگریزی اور فارسی زبان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انگریزی اس لئے کہ وہ برسرِ اقتدار طبقے کی زبان تھی۔ اور فارسی اس لئے کہ برصغیرِ پاک و ہند کے چھ سو سالہ تخلیقی اور علمی کارناموں کا بہت بڑا سرمایہ اسی زبان میں تھا۔ نیز یہی وہ زبان تھی جس سے اردو نے براہِ راست علمی۔ ادبی اور شعری فیضان حاصل کیا تھا۔ فورٹ ولیم کے بعد اس سلسلہ میں دلی کالج کا نام زبان پر آتا ہے۔ جہاں ۱۸۵۷ء سے قبل فاضل ادیبوں کی نگرانی میں سائنس، ریاضی اور تاریخ کی کئی اہم کتاب کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کرایا گیا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اس برصغیر کے مسلمانوں کے عظیم ترین قومی فکری اور تعلیمی رہنما سر سید احمد خان اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں مسلم قوم کی "نشأتِ ثانیہ" کے لئے دوسری تحریکیں شروع کیں وہاں انھوں نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی عمومی اشاعت و مقبولیت کے لئے بھی ایک عہد آفرین تحریک چلائی۔ سر سید نے جو تاریخ ساز کام انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں شروع کیا تھا اس کی حقیقی قدر و قیمت ہمیں ۱۹۴۷ء میں معلوم ہوئی۔ جبکہ عالمی نقشے پر ایک نئے ملک نے جنم لیا۔ بلاشبہ پاکستان علیگڑھ کی علمی اور فکری تحریک کا اک ثمر نورس ہے۔ سر سید نے دارالعلوم علیگڑھ کی بنیاد تو بعد کو ڈالی۔ اس سے قبل وہ اردو زبان میں تراجم کی وسیلہ سے تحریک شروع کر چکے تھے اور ان کی قائم کردہ "سائنٹفک سوسائٹی" اس سلسلے میں کافی کام کر چکی تھی۔ ۱۸۷۷ء

میں دارالعلوم علیگنڈہ کے قیام کے بعد سرسید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں میں حصول تعلیم کا عام شوق پیدا کرنے کے لئے ۱۸۸۱ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کانفرنس نے غیر منقسم برصغیر کے مسلمانوں میں علمی بیداری پیدا کرنے کے لئے کیا کچھ کیا، عام طور پر معلوم و معروف ہے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس پاکستان میں ان ہی عظیم روایات کی حامل ہے جو سرسید اعظم کی تعلیمی تحریک نے ہماری قومی زندگی میں قدم قدم پر قائم کی ہیں۔ حصول آزادی سے قبل تعلیم کا نصب العین وقت کے لحاظ سے کچھ بھی رہا ہو۔ آج یقیناً قومی تعلیم کا نصب العین صرف یہی ہو سکتا ہے کہ تعلیم تربیت کے ذریعہ پاکستان میں ایک ایسی نسل کو وجود میں لایا جاسکے جو نہ صرف ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے عظیم اور لاتعداد فرائض بحال لانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ بلکہ بین الاقوامی دنیا میں بھی اپنی سیرت و کردار اور مقاصد کے لحاظ سے ممتاز حیثیت کی مالک ہو۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی اور تبلیغی نصب العین یہی ہے۔ اسی نصب العین کا عکس کانفرنس کی "اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ" کی کارکردگی میں بھی جھلکتا ہے۔ یہ ادارہ تعلیم و ثقافت کی معیاری کتب کی تصنیف و تالیف اور بہت کتب دکان کی تصانیف کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے لئے سرگرم عمل ہے۔

امریکہ کے مشہور فلسفی ماہر تعلیم "پروفیسر جان ڈیوی" کی معرکہ الاراء وکتا "ڈیما کریسی اینڈ ایجوکیشن" کا پیش نظر ترجمہ "جمہوریت اور تعلیم" اسی سلسلے کی ایک نمایاں کڑی ہے۔

انسان معلومہ کی دس بارہ ہزار سالہ تمدنی تاریخ میں "تعلیم و تعلم" اور "درس و تدریس" کا نظام کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود رہا ہے۔ کیونکہ تعلیم کے بغیر تمدن کا کوئی مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ خود تمدنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ رضا کارانہ یا جبری بنیادوں پر معاشرے کے افراد کو خاص نظریات و مقاصد کی تعلیم دی جائے تاکہ معاشرہ میں معنوی ربط اور داخلی اتحاد پیدا ہو سکے۔ عہد حاضر کا معاشرہ بھی اندرونی اختلال و انتشار سے بچنے کے لئے ایک وسیع تعلیمی تحریک کا محتاج ہے اور خصوصیت کے ساتھ ہم پاکستانیوں نے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے چونکہ ابھی حال میں اپنی اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی شروع کی ہے لہذا اس سلسلے میں پروفیسر جان ڈیوی کا تعلیمی فلسفہ ہمارے ملک کے تعلیمی نظریات اور قوم کی نئی شیرازہ بندی کے دائرہ میں انقلاب عظیم برپا کر سکتا ہے۔ جان ڈیوی تعلیم اور فلسفہ کے منظر پر اس وقت نمودار ہوا تھا جب براعظم امریکہ نے صنعتی عمل اور عملی میدان میں ایک عظیم الشان پیشقدمی شروع کر دی تھی اور اس پیشقدمی کے آثار فکر و نظر کے ہر گوشے میں نمودار ہو رہے تھے۔ نئی دنیا کی فکری اور عملی زندگی کا شہر مرغ اپنے مہیب اور عظیم بڑے میں سے بمآمد ہو چکا تھا۔ اور اب وہ ایک لمبی تک و تاز کے لئے پر کھول رہا تھا پروفیسر جان ڈیوی کا فلسفہ تعلیم امریکہ کے عمل پسند صنعت کار کے اسی بنیادی ذہنی اور فکری رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔

سطور بالا میں امریکی قوم کی ہمہ جہتی پیش رفت اور ہمہ گیر پیشقدمی کے جس دود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کم و بیش ہماری قوم بھی اسی دور میں داخل

ہو چکی ہے۔ حکومت برطانیہ نے اپنے طریقہ سو سالہ دور حکومت میں تعلیم کو (اگر
 پر و فیسہ جان ڈیوی کے الفاظ استعمال کئے جائیں تو صرف اسنو قراطلی طبقے (نام
 نہاد طبقہ) (اشرافیہ) تک محدود رکھا۔ ڈیوی اسے لبرل طریقہ تعلیم قرار دیتا ہے۔
 اور دعویٰ کرتا ہے کہ جمہوریت کے اس دور میں حقیقی تعلیم وہ ہے جو مفید پیشوں
 کے ذریعے لوگوں کو دی جائے۔ ڈیوی تعلیم کو جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنا
 چاہتا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے اس نے ایک نیا فلسفہ تعلیم پیش کیا ہے۔ کوئی
 شبہ نہیں کہ ڈیوی کے فلسفے نے عہد حاضر کے علمی اور تدریسی تصورات کو اس
 شدت سے متاثر کیا ہے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

ہم پاکستان میں جمہوریت اور عملی زندگی بسر کرنے کے ابتدائی تجربات
 کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں نظام تعلیم کا سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔
 برطانوی عہد میں ہماری تعلیم زندگی کا جامد اور غیر متحرک نقطہ نظر پیدا کرنے کا
 ایک مہذب آلہ تھی۔ اس تعلیم کو جدید صنعتی عہد کے جمہوری اور عوامی تقاضوں
 سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ آپ انگریزی درس گاہوں میں
 تعلیم پا کر عہد و کسور یہ کے ایک شریف زادے بن جائیں۔ لیکن آپ کسی متحرک
 ترقی پذیر جمہوری معاشرے کے مناسب رکن بننے کی صلاحیت سے قطعاً محروم
 ہو جاتے تھے۔ حصول آزادی کے بعد بھی ہمارا نظریہ تعلیم اور نظام تعلیم وہی
 رہا جو عہد غلامی میں تھا۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ڈیوی کی کتاب کا مطالعہ
 از سر نو شروع کیا جائے صرف یہی کافی نہیں کہ تعلیمی دنیا کی یہ معرکتہ الماراء کتاب
 پاکستان میں نصاب درسی کا جزو بن کر رہ جائے اور یہ حیثیت تو اسے مدت

سے حاصل ہی ہے۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈیوی نے تعلیم کا جو فلسفہ پیش کیا ہے۔ اسے ہم اپنی قومی اور نظریاتی خصوصیات کے اضافے کے ساتھ اپنے نظام تعلیم کا جزو بنائیں۔ تاکہ پاکستان کا تعلیمی نظام ایک ابھرتی ہوئی قوم کی صنعتی۔ عملی اور تمدنی زندگی کے گوناگوں تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

آخر میں چند الفاظ میں اس کتاب کے ترجمے کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں چونکہ یہ کتاب عہد حاضر کی ان کتابوں میں سے ہے جو زبان و مطالب کے اعتبار سے حد درجہ اوق ہیں۔ اس لئے جب اس کے ترجمے کا وقت آیا تو سوال پیدا ہوا کہ اس مہم عظیم کو سر کون کرے۔ کسی علمی کتاب کا ترجمہ کرنا زبان دانی پر ہی موقوف نہیں ہوتا۔ آپ فارسی کے کتنے ہی پختہ کار ادیب کیوں نہ ہوں اگر آپ کو شعر سے فطری مناسبت نہیں تو عمر خیام کی رباعیات کا آپ ہرگز ترجمہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ڈیوی کی اس کتاب کو انگریزی زبان و ادب کا ہر مترجم اُردو میں منتقل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ مترجم کو فلسفے کے اعلیٰ مباحث اور فلسفی اور منطقی بحث و استدلال کے تمام داؤدیں کا نظری و عملی علم ہونا چاہیے۔ کیونکہ ڈیوی صرف ماہر تعلیم ہی نہیں عظیم المرتبت فلسفی بھی ہے اور اس کا شمار امریکہ کے تین رجال فلسفہ میں ہے۔ یہ ڈیوی کی خوش نصیبی ہے کہ اسے اپنی عظیم کتاب کے اُردو ترجمے کے لئے سید محمد تقی مل گئے جنہوں نے اس ترجمے میں طبع زاد تصنیف کا لہجہ اور حُسن پیدا کر دیا ہے۔ سید محمد تقی، مدیر روزنامہ جنگ کراچی، پاکستان کے ایک مقبول اُردو اخبار کے مدیر کی حیثیت سے اپنی صحافتی صلاحیتوں سے کتنے ہی مطمئن کیوں نہ ہوں لیکن واقعہ

یہ ہے کہ ان کا اصلی میدان عمل فلسفہ اور منطق ہے، انہوں نے اپنے فلسفیانہ مباحث پر بڑے معرکتہ الآراء مضامین انگریزی اور اردو زبان میں لکھے ہیں جن کی گونج، دور دور تک پہنچ چکی ہے۔ اور اب انہوں نے کانفرنس اکیڈمی کی فرمائش پر ڈیوی کو لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کی ترجمہ کتاب میں بہت اچھی تشریح تقی صاحب نے کی ہے، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس یہ علمی تحفہ بڑے فخر کے ساتھ ملک کے تعلیمی حلقوں کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ امید کہ اہل نظر اس ناچیز علمی خدمت کو شرف قبول عطا فرمائیں گے۔ آخر میں مجھے کارکنان اکیڈمی کی جانب سے وزارت تعلیم اور وزارت مال حکومت پاکستان کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرنا ہے جن کی معارف پروری کی بدولت یہ اور مثل اس کے دوسرے کام پایہ تکمیل کو پہنچ رہے ہیں۔

میسرز میکملن اینڈ کونیو یارک بھی ہماری سپاس گزاری کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہمیں ترجمہ کتاب کی اجازت مرحمت فرمائی۔



جمہوریت اور تعلیم

(حصہ اول و دوم)

(تصنیف: جان ڈیوی)

(ترجمہ: سید محمد تقی)

عہد جدید کے مشہور فلسفی اور ماہر تعلیمات پروفیسر جان ڈیوی کی حرکتہ آلاہ تصنیف "ڈیما کریسی اینڈ ایجوکیشن" کا یہ ترجمہ پہلی بار اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب کا دنیا کے کلاسیکی ادب میں شمار ہے۔ کیونکہ اس نے فلسفہ تعلیم میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ ڈیوی فلسفہ جدید، صنعتی زندگی اور آج کے حرکتی دور کی عکاسی کرتا ہے۔ ڈیوی کے نزدیک صداقت بڑی حد تک اس عمل کا نام ہے جو جسم نامی اور اس کے ماحول میں ہم آہنگی کے لئے ہوتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیوی اس بات پر شدت کے ساتھ مصرح ہیں کہ صداقت اور حقیقت جسم نامی ماحول میں ہم آہنگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی اور اٹھوں نے اسی نقطہ نظر کو اساس بنا کر اپنے انقلاب انگیز فلسفہ تعلیم کو مرتب کیا ہے جو بلاشبہ ان کے بہت بڑے کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں آپ جس نظریہ تعلیم کو پڑھیں گے وہ یہ ہے کہ جدید عہد کی صنعتی دنیا میں صحیح جمہوری تعلیم صرف وہ تعلیم ہے جس میں علم کا

حصوں مفید پیشوں کی عملی مشق کے ذریعہ ہو۔ پیمانے عرز کی کتاب کے مطالعہ کے ذریعہ نہیں۔ ڈیوی نے کہا ہے کہ لبرل طریقہ تعلیم جمہوری برادری کے لئے نہیں ہے۔ جمہوری دور کی تعلیم عملی پیشوں میں مشغول رہ کر ہو سکتی ہے۔ ڈیوی کے اس نظریہ تعلیم نے امریکہ کے نظام تعلیم میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اسے جدید صنعتی تقاضوں کے مطابق بنا دیا۔

جمہوریت اور تعلیم ان اہمات کتب میں شامل ہے جن کا کسی زبان میں موجود نہ ہونا اس زبان کی بے مائیگی کا ثبوت ہے۔

اس کتاب کا نہایت کامیاب ترجمہ سید محمد تقی مدیر اعلیٰ روزنامہ، جنگ کراچی نے کیا ہے اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے اسے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔



تاریخ تحریک آزادی

”پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی“ ہمارے ملک میں ایک سرگرم کار علمی ادارہ ہے جو گزشتہ آٹھ سال سے بہت مفید کام کر رہا ہے۔ اس کے صدر جناب فضل الرحمن صاحب سابق وزیر حکومت پاکستان اور اس کے روح رواں ہمارے عزیز و محترم دوست ڈاکٹر سید معین الحق صاحب ہیں، سوسائٹی اس وقت تک تاریخ کی کافی کتابیں شائع کر چکی ہے ایک سہ ماہی پرچہ بھی ”پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل“ کے نام سے جاری ہے۔

اس جماعت کی طرف سے سب کام انگریزی میں ہوتا ہے تاکہ پاکستان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جو اردو نہیں پڑھتا اور غیر مالک کے لوگ، ان مطبوعات کو پڑھ کر ہمارے ماضی کی تاریخ و ثقافت سے اگر بے خبر ہیں تو باخبر ہو جائیں اور اگر غلط رائے رکھتے ہوں تو صحیح رائے قائم کر لیں۔ ویسے بھی دو سو سالہ انگریزی دور حکومت کے رعب و دبدبہ نے انگریزی زبان کو اس قدر شرفیہ کے مقابلہ میں ایک انتہائی بااثر مقام کا مالک بنا دیا ہے اور انگریزی کی کتابوں کو لوگ چاہے سمجھیں یا نہ سمجھیں خاص وقعت کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ انگریزی زبان میں کتابیں لکھنے اور چھپوانے میں ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہیں اور ان کا مارکیٹ بھی لا محدود ہے ان ہی

سب باتوں کے پیش نظر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے قومی و ملی تاریخ انگریزی زبان میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اور اپنے تالیفی و تحقیقی کام میں یہاں تک احتیاط برتی ہے کہ اردو ماخذوں تک سے کام نہیں لیا ہے۔ کیونکہ بقولے

”اردو کی سند کا کیا بھروسہ؟“

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا سب سے اہم کام ”تاریخ تحریک آزادی“ کی چار جلدوں میں تدوین ہے جس کی بڑے سے سائز کی چھ سو صفحات پر مشتمل پہلی جلد ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے بورڈ آف اڈیٹرز میں ڈاکٹر محمود حسین خاں، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مسٹر ایم بی احمد، پروفیسر اے، بی، اے حلیم، شیخ محمد اکرم، ڈاکٹر اے حلیم، اور ڈاکٹر ستید معین الحق شامل ہیں۔ اس بورڈ کا تقرر ۱۳ جون ۱۹۵۲ء کو حکومت پاکستان نے بذریعہ سرکاری گزٹ کیا تھا۔ پانچ سال کی جدوجہد اور صرف کثیر کے بعد پہلی جلد شائع ہوئی ہے اور چونکہ اس جلد کی اشاعت کی بدولت، دفتر کتب خانہ اور ضروری مواد کی فراہمی اور کام کرنے والوں کی تنظیم مکمل ہو گئی ہے اس لئے بقیہ تین جلدوں کی تیاری میں نہ اس قدر تاخیر ہوگی اور نہ اس درجہ مشکلات کا سامنا ہوگا۔

زیر نظر جلد اول کے بیس ابواب ہیں جنکو سولہ اصحاب نے لکھا ہے، پہلا تمہیدی باب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا تحریر کردہ ہے۔ اور ہماری ناچیز رائے میں پوری کتاب میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے، ستاؤن صفحات میں جناب ڈاکٹر صاحب موصوف نے ہندو عہد سے لیکر موجودہ زمانہ تک برصغیر پاک و ہند میں مختلف اقوام اور جماعتوں کے عروج و زوال کی داستان اور ان کے اسباب و

علل پر نہایت عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔ ان حالات و واقعات کو بڑی خوش اسلوبی سے یکجا کیا ہے۔ جو اسلامی سلطنت کے زوال کا باعث ہوئے مسلمانوں کے زوال کی کیفیت بیان کرنے میں ایک نقطہء عروج پینڈا کر کے کچھ ایسا محسوس کرایا، جو کہ اب یہ قوم کبھی نہ اُسبھر سکے گی۔ اس منزل کے بعد اور یہ فضا پیدا کر کے ڈاکٹر صاحب نہایت ڈرامائی طریقہ پر سرسید کی شخصیت کو میدان میں لائے ہیں۔ اور بجا طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایک ”مردے از غیب“ تھے جنہوں نے مسلم قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کی کامیاب ناخدائی کی۔ افسوس ہے کہ تقسیم کار کی پابندیوں کے باعث ڈاکٹر صاحب مسلمانانِ پاک و ہند کی نشاۃ ثانیہ اور قیامِ پاکستان کی تمام و کمال داستان نہ لکھ سکے۔ بیٹابی کے ساتھ جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہی پوری کتاب لکھتے اور بلا فصل ذہنی ہم عمرت انہیں کو پڑھتے۔

کتاب کے اگلے ابواب میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے خلائعہ بیان کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اور واقعات کو از سر نو دہرایا گیا ہے۔ اس ذیل میں باب دوم ”آثارِ زوال“ از ڈاکٹر ریاض الاسلام۔ باب سوم ”عالمگیر کے جانشین“ (بہادر شاہ اول تا محمد شاہ) از ڈاکٹر سید معین الحق۔ باب چہارم ”احمد شاہ عالمگیر ثانی اور شاہ عالم“ از ڈاکٹر سید معین الحق۔ باب پنجم ”سکھوں کا عروج و زوال“ از مولانا رشید اختر ہمدومی۔ باب ششم از جناب تفصیلی داؤد و ڈاکٹر احمد رشید۔ باب ہفتم ”نوابانِ اودھ از مرزا علی انظر برلاس خصوصی درجہ رکھتے ہیں مشہور و معلوم تاریخی واقعات کو اچھی ترتیب و زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔ باب ہشتم ”اصف جاہ اول“ از جناب ڈاکٹر اے۔ رحیم معرکہ کا

مضمون ہے اور آصف جاہ اول کے کارناموں کی ایسی اچھی تصویر غالباً اس سے پہلے نہیں پیش کی گئی۔ باب نہم ”شاہ ابدالی اور تیسری جنگ پانی پت“ از ڈاکٹر سید معین الحق یہ مضمون بھی کتاب میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے جس کی تیاری میں ڈاکٹر صاحب نے کس قدر محنت، کس قدر چھان بین اور کس قدر مواد فراہم کیا ہوگا۔ اس کا صحیح اندازہ عام قارئین نہیں کر سکتے، بحیثیت مؤلف حیات حافظ رحمت خاں، چونکہ ہماری اس دور کی تاریخ پر کچھ نظر ہے اس لئے ہم اس باب کی نہایت کامیاب تدوین پر جناب ڈاکٹر صاحب موصوف کو پُر خلوص داد دینے پر مجبور ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مشہور جنگ پانی پت پر اس سے اچھا مقالہ لکھنا ممکن نہ تھا۔ باب دہم مخصوص روہیلوں کے متعلق ہے جس کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ رشید صاحب نے واقعات کی ترتیب و تفحص میں کافی کاوش کی ہے لیکن یہ مضمون دل پر کوئی دیر پا اثر چھوڑنے میں کامیاب نہ ہوا۔ یہ مقالہ ایک اور ایک دو قسم کی چیز ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ آج کے ہندوستان میں بیٹھ کر اٹھارویں صدی عیسوی کے روہیلہ مجاہدین اسلام کی متلی خدمت و کارگزاری کا صحیح اعتراف کرنا آسان نہیں ہے، روہیلہ تحریک مسلم لیگ تحریک کے مانند تھی اور روہیلوں نے گرتے ہوئے اسلامی وقار کو سہارا دینے کے لئے ہندوؤں، مرہٹوں، جالوں اور سکھوں کے خلاف جان کی بازی لگائی تھی۔ لہذا ان کی سرفروشی کی حقیقی داستان ایک ”آزاد مسلمان“ سپر و قلم کر سکتا ہے۔ باب یازدہم ”بنگال میں جدوجہد“ ڈاکٹر اے حلیم کا نوشتہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ کے ایک محنتی وسیع المطالعہ

اور ذہین طالب علم رہے ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین ہیں آپ نے اپنے مضمون کو جو موضوع کے اعتبار سے بے انتہا الجھا ہوا تھا سلیقہ سے لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ مسلم حکمرانوں کی تمام جدوجہد کا آج کیا خلاصہ رہا اور موجودہ حالات پر کچھلے واقعات کس کس طرح اثر انداز ہوئے۔ باب دو آزدہم ڈی ایسٹ انڈیا کمپنی، از پروفیسر ناردار خان اس مقالہ میں زبان و بیان کی خوبی لا جواب ہے۔ اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوا کہ گو یا پروفیسر صاحب موصوف ایم۔ اے فائنل کلاس میں اپنا فصیح و بلیغ لکچر دے رہے ہیں۔ چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ تمام طلباء تاریخ کو از بر یاد ہے اس لئے پروفیسر صاحب نے اپنے مقالے کو ماخذوں کے حوالوں سے بھی گراں شمار نہ کیا اور ایک ہلکے پھلکے انداز میں کمپنی کے تمام اچھے برے اعمال کو پیش کر دیا۔

سیزدہم۔ چہار دہم و پانزدہم۔ یہ ابواب ”جیدر علی اور شیپو سلطان“ کے بارے میں ڈاکٹر اے، رحیم اور جناب ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ اور دکن کے ان نامور مجاہدوں کے ولولہ انگیز حالات بڑے حسن و خوبی کے ساتھ سپرد قلم کئے ہیں۔ باب شانزدہم ”شاہ ولی اللہ“ حصہ اول از جناب شیخ محمد اکرام صاحب۔ شیخ صاحب نے جیسی کہ ان سے توقع تھی حضرت شاہ ولی اللہ کے سوانح اور مذہبی اصلاح کے کارناموں کی نہایت دل آویز تصویر کشی کی ہے۔ آپ کا مقالہ آپ کی وسیع النظری اور وسعت معلومات کا بہترین نمونہ ہے۔ افادیت کے اعتبار سے بھی یہ باب خوب ہی خوب ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی شخصیت اور ان کے مذہبی مشن کو سمجھنے کے لئے اُمیہ موزوں

کو اس کا مطالعہ ناگزیر ہو گا۔ باب ہفتم "شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ دوم" از پروفیسر خلیق احمد نظامی (مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) اس باب میں حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ بہت سا اچھوتا مواد فراہم کیا گیا ہے جو اب تک لوگوں کے علم میں نہ تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ایک ہونہار نوجوان ہیں اور انھوں نے عہد زوال کی تاریخ کی چھان بین اور چھپی ہوئی معلومات کو منصفانہ طور پر لانے میں گزشتہ چند سالوں میں بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں، پاکستان ہسٹاریکل بورڈ لائق مبارکباد ہے کہ اس نے حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی خدمات و نظریات لکھنے کے لئے پروفیسر نظامی کا انتخاب کیا۔ وہ ایک جوہر قابل اور ایک آزاد قلم کے مالک ہیں جو کچھ لکھتے ہیں اس میں دیانت، روحانیت اور بے لوث فکر و نظر کی کار فرمائی ہوتی ہے، مسلمانوں کی تحریک آزادی کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے انہوں نے معلومات کے بڑے بڑے خزانوں کے منہ کھول دیئے ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے باب اول اور ڈاکٹر معین الحق کے باب نہم کی طرح پروفیسر خلیق نظامی کا تحریر کردہ یہ باب بھی کتاب کی جان ہے اور اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ باب ہزوم "بنگال میں تحریک اصلاح" از ڈاکٹر عبدالباری یہ مقالہ بھی مفید اور معلوماتی ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ باب نو ہزوم و تبتم "سید احمد شہید" یہ دونوں ابواب حضرت سید احمد شہید کے حالات زندگی و تعلیمات اور داستان جہاد سے متعلق ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی "سیرت سید احمد شہید" اور مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "سید احمد شہید" ماضی قریب میں شائع ہو چکی ہیں۔

کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر محمود حسین صاحب اگرچہ معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہ کر سکے لیکن پھر بھی محدود صفحات میں سید احمد شہیدؒ کی ایک کمل تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور ان کی مہارت فن کا قدم قدم پر اعتراف کرنا پڑتا ہے۔



کتاب کے مندرجہ بالا بیس ابواب پر جو تبصرہ کیا گیا وہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک کے زمانہ کی چار جلدوں میں سے ایک جلد ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء تک کے دور پر (گویا، حاوی ہے۔ لیکن متفرق مقالات کا مجموعہ ہونے کے باعث اجتماعی حیثیت سے کوئی مسلسل و مربوط چیز سامنے نہ آسکی، ہمارا خیال تھا کہ تمام لکھنے والوں کے فراہم کردہ مواد سے کام لیکر اگر کوئی ایک چیف ایڈیٹر پوری کتاب کو لکھنا تو اس پر لفظ تاریخ کا بہتر طریقہ پر اطلاق ہوتا۔ مجموعہ مقالات کو ہم کس طرح "تاریخ" کہیں، یہ چیز سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر تاریخ تحریک آزادی کی بقیہ تین جلدیں بھی اسی ہیچ پر تیار کی جانے والی ہیں تو ہمیں اس پر نہایت ادب کے ساتھ اعتراض ہے۔ قبل ازیں اس عہد کے متعلق ولیم اردن کی کتاب "آخری مغل حکمران"، دو جلدیں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء اور اس کے بعد سر جادونا تھسکر کار کی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۲ء متعدد جلدیں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ اسی طرح میجر بی۔ ڈی۔ باسو کی لکھی ہوئی مشہور ضخیم کتاب "ہند میں کرسمین اقتدار کا عروج" چھپ چکی ہے۔ ان کتابوں کو مسلسل و مربوط طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔ اور یہ طرز مسلمہ اور مقبول ہے۔ اس سے ہٹ کر "تاریخ تحریک آزادی" میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ

نہ صرف لکڑیاں اور ذہنی الجھنوں کو دعوت دیتا ہے بلکہ غیر دلچسپ ہونے کے باعث زیادہ محنت سے گریز کی بھی غمازی کرتا ہے۔

دوسرا نکتہ اس سلسلے میں یہ ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ انگریزوں اور ہندوؤں نیز خود مسلمانوں کے ایک فرقے نے برصغیر پاک و ہند کی تاریخیں اپنے مخصوص مصالح کے تحت لکھ کر شائع کی ہیں مسلمانوں کی طرف سے پاکستان بننے کے بعد یہ پہلی منظم و باوقار کوشش ہے جو ہٹلر ریگل سوسائٹی کی جانب سے مسلمانانِ پاک و ہند کی صحیح تاریخ لکھی جانے کے لئے کی جا رہی ہے۔ اور ہم عنفائی سے یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ اس میں قومی عصبیت کا عنصر غالب ہونا چاہیے۔ بے تعلق منصف مزاجی جس سے اغیار کو کچھ شکایت پیدا نہ ہو ہمارے کام کی چیز نہیں ہو سکتی۔ جارحانہ اقدامات کا قاطع جواب دینے کی ضرورت ہے۔ اور یہ ضرورت اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کوئی ایک شخص قومی جوش و خروش کے ساتھ ایک ہی نصب العین کے تحت پوری کتاب مسلسل و مربوط تیار کرے اور اس سے وہ نتائج اخذ کرے جن سے مستفید ہونے کے لئے مظلوم ملت اسلامیہ پاک و ہند عرصہ سے بیتاب ہے۔

ایک اور اہم چیز جس کی طرف اشارہ کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ جس طرح مغلوں سے پہلے پٹھان دور حکومت میں اشاعت اسلام کا سب سے زیادہ کام ہوا۔ اسی طرح مغلیہ زوال کے بعد اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں اسلام اور مسلمانوں کا اقتدار اس سرزمین سے مٹایا جا رہا تھا تو پٹھان سر فروشوں نے ہی سب سے زیادہ تیز اور موثر کام کیا۔ یہ وہ پہلے پٹھان

تھے۔ علی محمد خاں۔ حافظ رحمت خاں۔ محمد خاں بنگلشن۔ احمد خاں بنگلشن۔ نواب
نجیب الدولہ۔ غلام قادر روہیلہ۔ نواب امیر خاں اور جنرل نخت خاں ۱۸۵۷ء
سے ۱۸۵۸ء تک پورے ڈیڑھ سو سال سرفروشی کرتے رہے اور ان کے مجاہدات
کی کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔ یہی زمانہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے
جانشینوں کا ہے۔ ایک ہی زمانہ، ایک ہی مقام یعنی شمالی ہندوان کی جنگی و
روحانی تگ و تاز کا میدان رہا۔ ناممکن ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت
پر اثر انداز نہ ہوئی ہو اور جبکہ دونوں کا مقصد اسلامی اقتدار اعلیٰ کی گرتی ہوئی
دیوار کو سہارا دینا تھا تو یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک دوسرے میں اتحاد و عمل نہ رہا
ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے مشہور تاریخی "خواب" کی
تعبیر متذکرہ روہیلہ سرداروں کی کرد و کاوش میں نظر آتی ہے۔ اور ان کی فوجوں
کے ساتھ ولی اللہی سلسلے کے علماء کی بھڑیں کی بھڑیں چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں
اب تک عام طور پر یہ ہوتا رہا ہے کہ روہیلیوں کی تاریخ علیحدہ اجمالاً لکھ دی جاتی
ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کی تاریخ جداگانہ مرتب کر دی
جاتی ہے۔ جس سے یہ قطعاً ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کا ایک دوسرے سے کوئی ربط
و اتحاد بھی تھا۔

آخری گزارش یہ ہے کہ موجودہ جمہوری دور میں اچھے یا بُرے مسلمان
بادشاہوں اور حکمرانوں کی تاریخ میں اب کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے۔
"مسلمانانِ پاک و ہند کی تاریخ تحریک آزادی" لکھنی چلہیے جس کا آغاز
عہد جہانگیری میں حضرت مجدد الف ثانی رحمہ سے ہوتا ہے جنہوں نے احیائے

اقدار اسلامی کے لئے خود اپنیوں کے خلاف جہاد کیا۔ اس کے بعد رانا پرتاب اور شیواجی کی چلائی ہوئی ہندوانہ تحریک سے ہمارا تصادم چلتا رہا۔ پھر شمال مغرب کے بیرونی حملہ آوروں سے لڑ بھڑ ہوئی اور آخر میں ہندوؤں اور انگریزوں کے متحدہ محاذ سے مقابلہ رہا جس میں عام طور پر مسلمان حکمرانوں نے تو بزدلی یا قوم فروشی کا ثبوت دیا اور مسلم عوام اور ان کے سر فروش رہنماؤں نے بے مثل بہادری و ایثار کے نمونے پیش کئے تا آنکہ جغرافیائی حیثیت سے ۱۹۴۷ء میں بیس فیصدی کامیابی بصورت قیام پاکستان اور آئندہ پیش آنے والے واقعات جن کے نتیجے میں ہر فرد ملت آزادی و خوش حالی کا سچل کھاسکے۔ ہماری تحریک کی مختلف ارتقائی منزلیں ہیں جن پر ایک قومی مورخ کو نظر رکھنا ہے

ان تاثرات کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ محض پرانے ڈگر کی تاریخ لکھنے اور ”شراب کہنہ در جام نو“ سے کام نہ چلے گا۔ نئی فکر و نظر اور جدید تحقیقات و اجتہاد کی ضرورت ہے اور اس خصوص میں ہم پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے معزز و محترم علمائے تاریخ سے مایوس نہیں ہیں۔

ہمیں یقین واثق ہے کہ وہ ”تاریخ تحریک آزادی“ کی آئندہ تین جلدوں میں نیز دوسری قیمتی مطبوعات کے ذریعہ دیرینہ قومی و ملی آرزوں کو بروئے کار لانے میں انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ

مذاہب عالم

(تالیف پروفیسر احمد عبدالرشید المدوسی)

پاکستان بالخصوص کراچی میں بہت سے ایسے باکمال موجود ہیں جو اخباری و اشتہاری نہیں ہیں۔ نیز ظاہری ذجاہت اور مالی اعتبار سے بھی نمایاں نہیں اور اس لئے اس قدر معروف نہیں ہیں کہ حکومت اور دوسرے معارف پرور لوگ ان پر توجہ کر سکیں۔ وہ خود اپنی جگہ نام و نمود سے بے نیاز دن رات علمی تحقیقات و احیائے دین کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہیں چنانچہ ایسے ہی ایک بزرگ جناب پروفیسر احمد عبدالرشید المدوسی ہیں جن کی چار کتابیں (۱) منشور متحدہ اقوام (۲) اصول قانون (۳) قانون روم (۴) اسوۂ حسنہ (۵) اور اذریقہ ایک چیلنج شائع ہو چکی ہیں اور چار مزید کتابیں (۱) اسلام اور عالمی کشش مکش (۲) اسلام میں رسم و رواج (۳) اسلام کا مالیاتی نظام اور (۴) اسلامی نظام قانون زیر ترتیب ہیں۔

ان کے علاوہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ علمی۔ کتاب ”مذاہب عالم“ ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعہ۔ اعداد و شمار اور بصیرت افروز نقشہ جات کے ذریعہ دنیا میں مسلمانوں کی معائنہ ترقی

دسیاسی پوزیشن کو واضح کیا گیا ہے۔ کتابت، طباعت، جلد اور گروہ پوش کے اعتبار سے تقریباً پانچ سو صفحات کی یہ ضخیم کتاب ہمارے علمی سرمایہ میں ایک نہایت قیمتی اضافہ ہے۔

جو کام ایک پوری اکیڈمی کے کرنے کا تھا وہ سخت مالی مشکلات کے باوصف تنہا مسدوسی صاحب نے کیا ہے۔ کتاب کے خاص ابواب یہ ہیں :-

- (۱) مذہب کی تعریف و اقسام (۲) مسلم آبادی سے متعلق اعداد کی چھان بین اور غلطیوں کی اصلاح (۳) مسلم آبادی کی تفصیلی فہرست ممالک کا رقبہ و آبادی (۴) مسلم آبادی کا تجزیہ و تقسیم (۵) بت پرستی (۶) بد مذہب (۷) تاؤمت (۸) سکھ مذہب (۹) شنتو مذہب (۱۰) عیسائیت (۱۱) کنفیوشی (۱۲) ہندو مذہب (۱۳) یہودیت

اس کے بعد کتاب میں مذاہب عالم کا ایک عالمانہ تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، آخر میں متعدد ضمیمے ہیں جن میں ہر قسم کی قیمتی معلومات جمع کی گئی ہیں۔ کتاب میں جو نقشے دیئے گئے ہیں وہ اس کی جان ہیں اور یہ اندازہ کرنا دشوار ہے کہ ان کی تیاری میں کس قدر روپیہ اور کاوش صرف کی گئی ہوگی۔ نقشوں کی تفصیل یہ ہے۔

- (۱) دنیا کا مذہبی و سیاسی نقشہ (۲) مسلم افریقہ کے نقشے (۳) دنیا میں مسلمان (۴) جنوب مشرقی ایشیا (۵) مشرق وسطیٰ (۶) تیل کے حقے (۷) فلسطین کی تقسیم کا نقشہ (۸) وسط ایشیا میں روسی استعمار کا تاریخی نقشہ (۹) استعمار کا عروج و زوال۔

کتاب کو جناب زاہد حسین صاحب مرحوم و مغفور کے نام نامی پر معنون کیا گیا ہے۔ آغاز کتاب میں زاہد حسین صاحب مرحوم کے اس خطبہٴ صدارت کا اقتباس بھی دیا گیا ہے جو انہوں نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کراچی منعقدہ مارچ ۱۹۵۷ء میں ارشاد فرمایا تھا اور جو گویا بطور پیش لفظ کتاب ہے اور جس کو اساس کتاب سمجھنا بیجا نہ ہوگا۔

یہ کتاب بہت تفصیلی غور و مطالعہ کی محتاج ہے، ارباب حکومت اور ملک کی علمی جماعتوں کا فرض ہے کہ اس کی خاطر خواہ قدر افزائی کریں اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

پروفیسر مسدوسی کے بے لوث کردار سے ہم واقف ہیں انہوں نے جو محنت کی ہے وہ صرف ملک و ملت کے اعلیٰ مفاد کو پیش نظر رکھ کر کی ہے۔



ارتقاء انسانیت

مصنفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری

انسانی اذوالو العزیموں اور سائنسی ایجادات کی بدولت جب سے ذرائع آمدورفت اور رسل و رسائل کی زیادہ سے زیادہ آسانیاں ہتیا ہوئی ہیں ترقی یافتہ اور مہذب انسان کا تصور زمان و مکان اپنے شہر صوبہ اور ملک سے وسعت پذیر ہو کر ساری دنیا اور دنیا کے ہر حصہ پر حاوی ہو گیا ہے۔ اس زمانہ کا انسان تیز پیوں اور سمندری اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ اس قدر قلیل مدت میں ساری دنیا کی سیر کر لیتا ہے کہ اتنی مدت میں زمانہ قدیم میں اس سے اپنے تک کی سیروسیاحت بھی کسی طرح ممکن نہ ہو سکتی تھی۔ اسی طرح خاص اپنے ملک کے دوزدرا محصول کی نیز دوسرے ممالک کی جو خیریں برسوں، مہینوں، ہفتوں اور دنوں میں ملا کرتی تھیں وہ اب منٹوں اور سیکنڈوں میں ہم تک پہنچ جاتی ہیں۔ دنیا کے رہنے بسنے والوں کے اچھے یا برے باہمی تعلقات اور ان کی ہر قسم کی ضروریات ایک دوسرے سے اس درجہ وابستہ ہو گئی ہیں کہ ان کا چند صدی پہلے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ موجودہ دور کی ہمہ گیری کی بدولت ہر قسم کی علمی، تعلیمی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی تحریکیں بھی ہمہ گیر ہیں۔ کسی ایک ملک کی معاشی حالت خراب

ہو جاتی ہے یا دوسرے ممالک کے مقابلہ میں ضرورت سے زیادہ بہتر ہو جاتی ہے۔ کوئی اہم ایجاد اور علمی تحقیق ہوتی ہے، یا کوئی زبردست سیاسی واقعہ رونما ہوتا ہے تو برقی رو کی طرح اس کا اثر ساری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ حالات کی تیز رفتاری نے ایک ترقی یافتہ ملک اور قوم کو دوسرے ممالک اور اقوام سے ہمہ وقت باخبر رہنے اور تعلقات قائم رکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ وہ اپنے ملک کے سوا دوسرے ملکوں اور قوموں کے بارہ میں بھی ہر قسم کی معلومات حاصل کرے۔ نہ صرف جدید بلکہ قدیم بھی اور یہ معلومات تمام ممالک اور اقوام کی ترقی و دستار کی علیحدہ علیحدہ اور یک جانی تاریخ کے مطالعہ سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اسی سبب سے پوری دنیا کی قدیم و جدید تاریخ کے پڑھنے اور لکھنے کو اول درجہ کی اہمیت دی جاتی ہے۔

کوئی شخص اس وقت تک کامیاب تاجر۔ صنعت کار۔ معلم۔ ادیب۔ صحافی۔ سیاست داں اور حکمراں نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسکو ساری دنیا کی تاریخ پر عبور نہ ہو۔ تاریخ عالم کی اسی اہمیت کے پیش نظر اشتراکی لٹریچر اور دوسرے یورپین لٹریچر میں دنیا کی بکثرت تاریخیں مختلف عنوانوں سے لکھی جا چکی ہیں۔

مشرقی زبانوں بالخصوص اردو زبان میں سائنٹیفک نقطہ نظر سے جدید ترین ارضی و سماوی تحقیقاتوں کی روشنی میں اس وقت تک کوئی مستند کتاب موجود نہیں ہے۔ مولانا سید طفیل احمد صاحب نے جن کی نگاہ دور رس، مطالعہ وسیع اور قوت تحریر بے پناہ تھی۔ جہاں تک ہمیں علم ہے ایک نہایت پرکار انداز

میں سب سے پہلے قدم اٹھایا اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا۔
 ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں وہاں کے باکمال اصحاب
 کے علمی و تحقیقی کام کو اجتماعی شکل دینے کی غرض سے جب راقم نے "مجلس مصنفین"
 قائم کی تو اس کے (۶۲) جلسوں سے (۸) جلسوں میں جناب مولانا نے اپنی اسی
 زیر تالیف "تاریخ عالم" کے مقالے پڑھ کر سنائے۔ جنکو ہم نے اپنے مجلہ "مصنف"
 علی گڑھ میں محفوظ کر دیا تھا۔ ان میں سے تین مقالوں میں مولانا نے "تخلیق
 کائنات۔ اور ابتدائی انسان" وغیرہ جیسے انتہائی اہم موضوعات پر موجودہ سائنس
 اور جدید علمی و تاریخی تحقیقاتوں کی روشنی میں جس تسلسل اور روانی کے ساتھ
 روشنی ڈالی ہے وہ انھیں کا حصہ تھا۔ دنیا کے قدیم کایہ حصہ ایک طرف پارہ معلوما
 ہے تو دوسری طرف حد درجہ عبرت خیز ہے۔ سبق آموز حصے وہ ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا
 ہے کہ موجودہ زمانہ کے مختلف مذاہب و ملل کے پیروؤں میں جو روایات عقائد کے
 درجہ پر پائی جاتی ہیں اور جن میں ایک دوسرے پر برتری ثابت کرنے کے لئے
 شدید نزاعات برپا ہیں وہ دراصل اس زمانہ قدیم کی چیزیں ہیں جبکہ موجودہ
 مذاہب و ملل کا وجود بھی نہ تھا۔ اگر فراخ دلی اور روشن دماغی کے ساتھ مقالات
 کے ان حصوں کو پڑھا گیا اور ان سے صلح اثر بھی قبول کیا گیا تو یقین ہے کہ
 مختلف انسانی جماعتوں کے درمیان نفاق و شقاق کے بہت سے دروازے
 بند ہو جائیں گے۔

ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ دنیا اخلاقی و تہذیبی اعتبار سے ترقی کر رہی
 ہے۔ اور ہماری یہ ترقی گویا معراج کمال پر پہنچ چکی ہے۔ لیکن تاریخ عالم کے

ان پرانے واقعات کے مطالعہ سے واضح ہو گا کہ ابتدائی انسان اور قدیم زمانے کے لوگوں کی اخلاقی قدریں اور کردار نیز دنیا کو ہر میدان میں ترقی یافتہ بنانے کے لئے ان کی زبردست کوششیں ہم سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ تھیں۔ چوں کہ عام طور پر ہم تجھے مڑا کر نہیں دیکھتے اس لئے ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ اخلاقی طور سے ہم کس درجہ پسماندہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

مولانا سید طفیل احمد صاحب کی یہ کتاب جس قدر مفید اور پڑا معلوم ہے، یقین ہے کہ اسی قدر اس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اور عوام و خواص، کم علم اور زیادہ علم کے لوگ اس سے یکساں طور پر مستفید ہونگے (انشاء اللہ)

آخر میں کارکنانِ کانفرنس اکیڈمی کی جانب سے میں مصنفِ علام کے خلیفہ الصدق جناب مولوی محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ ممبر بھارتی پارلیمنٹ (الہ آباد) کا بہ دل شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے ذریعہ کتاب ہذا کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔



پراسرار کائنات

* تصنیف: ہنریس جینس * ترجمہ: سید محمد تقی بی، اے

یہ دنیائے فلسفہ اور سائنس کی ایک ممتاز اور مستند کتاب ہے۔ اس میں قابل مصنف نے محققانہ طور پر ان مباحث علم طبیعیات پر روشنی ڈالی ہے جو اس عہد کے اوائل میں ظہور پذیر ہوئی تھیں اس کتاب میں صاحب موصوف نے چار مضامین میں علم طبیعیات پر بحث کی ہے۔ "مرتا ہوا سورج" "جدید طبیعیات کی نئی دنیا" "مادہ اور حرارت"۔ "اضافیت اور ایٹم" اور "آخری بحث ان سب مسائل کو ملا کر فلسفیانہ طرز پر کی ہے۔ ان مضامین پر اس طرح مصنف نے روشنی ڈالی ہے کہ ایک وہ شخص بھی جو علم سائنس سے نا بلد ہو انھیں سمجھ سکے۔ اگر اس کتاب کو چالیس سال کے تحقیقاتی مسائل کا انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

جناب سید محمد تقی صاحب ایڈیٹر جنگ نے اس کتاب کا ترجمہ

نہایت سلیس اور رواں اردو میں کیا ہے اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے اسے شائع کیا ہے یہ ترجمہ صرف ترجمہ ہی نہیں بلکہ ایک قابل مطالعہ تالیف ہے۔ یہ کتاب زبان اردو کے ذخیرہ میں ایک مایہ ناز اضافہ

ہے۔ جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اور ڈاکٹر سید مجتبیٰ کریم صاحب
 ڈین آف دی فیکلٹی آف سائنس کراچی یونیورسٹی نے اس کتاب پر عالمانہ،
 مقدمہ اور تعارف لکھا ہے۔



مشاہیر کے تعلیمی نظریئے

(مقدمہ)

وقت عزیز رفت بیا تا قضا کنیم

عمرے کہ بے حضور صراحتی و جام رفت

زیر نظر کتاب اپنے وسیع موضوع کے اعتبار سے "حرفِ آخر" نہیں ہے بلکہ اسے "حرفِ آغاز" کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اور اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں ہزاروں ہزار ایسے مشاہیر گزرے ہیں جنہوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں توسیعِ تعلیم اور خدمتِ علم میں گزاری ہیں۔ اور ان کے نتائج فکرو عمل کو یکجا کیا جائے تو لاتعداد ضخیم مجلدات تیار ہو سکتی ہیں۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ قومیں اپنے مشاہیر کے نظریاتِ علمی و تعلیمی کی تحقیق کر رہی ہیں اور ان کی مدد سے نہ صرف کائنات کے راز ہائے سر بستہ کو روشنی میں لایا جا رہا ہے بلکہ اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے حصولِ علم کو زیادہ سے زیادہ آسان اور مفید بنانے کی سعی کی جا رہی ہے۔ صرف پاکستان اس باب میں سب سے پیچھے ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا قدیم نظامِ تعلیم جو عربی، ایرانی اور

ہندوستانی تہذیبوں کے امتزاج کا نتیجہ تھا۔ برطانوی استعمار کی چیرہ دستیوں کی نذر ہو گیا۔ نئے حکمرانوں نے اپنی مخصوص مصالح کے تحت جو نظام جاری کیا وہ پورے طور پر قابل قبول نہ ہو سکا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ بادل ناخواستہ اسے درجہ قبولیت دیا گیا مگر ساتھ ہی پورے نوے سال تک یہی خواہان ملک مسلسل ایک قسم کی ذہنی کش مکش میں مبتلا رہے اور توسیع تعلیم کی جدوجہد کے ساتھ ہی ساتھ اس کی اصلاح اور اس کو مناسب حال بنانے کی کوشش سے بھی غافل نہ رہے۔ یہ کوشش کچھ کچھ بار آور ہوئی مگر زیادہ تر غیر ملکی حکمرانوں اور ہندو اکثریت کی پیدا کردہ رکاوٹوں کے باعث حسب وخواہ طریقہ پر کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکی۔

مسلم مصنفین اور مدیران جسراند کے بصیرت افروز مضامین، قومی شعرا کی ولولہ انگیز اصلاحی نظمیں۔ مسلم یونیورسٹی کا نووکیشن ایڈریس، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کے خطباتِ صدارت، مقالات اور منظور شدہ تجاویز انتہائی عرق ریزی اور دیدہ وری سے تیار کی جاتیں ان کی اشاعت ہوتی اور چند روز ان کا چرچا ہونے کے بعد وہ نسیا منسیا ہو جاتیں۔ ہم میں سے وہ لوگ جو اپنی عمروں کا بڑا حصہ عہدِ مجبوری و غلامی میں گزار چکے ہیں حصول آزادی کے بعد بھی اُس تلخ کامی کو آج تک نہ بھولے ہیں جو عہدہ سے عہدہ عزائم و تجاویز کے بیدردی سے ٹھکرا دئے جانے پر محسوس کیا کرتے تھے۔ لیکن حیرت و حسرت ہے کہ مجبوری و غلامی کی زنجیریں کٹ جانے کے بعد ہم نے آزادی سے وابستہ اپنی تمام اُمیدوں اور منصوبوں

کو بالکل فراموش کر دیا۔ اور اس پورے سو سالہ لٹریچر کو جس میں بزرگوں کی تیار کی ہوئی تعلیمی اسکیمیں۔ نتائج تحقیق اور افکار و نظریات عالیہ درج ہیں بیکسر فراموش کر دیا۔



قیام پاکستان سے پہلے ہم نے بار بار یہ بات کہی اور سنی تھی کہ پاکستان مسلمانوں کی ثقافتی قدروں کے تحفظ اور اس معاشی و سماجی نظام کی تجربہ گاہ کے طور پر بنایا جا رہا ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے اور جو جدید دنیا کے مصائب و آلام کا واحد علاج ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ دعویٰ جس بلند آہنگی اور تسلسل سے کیا گیا تھا اسی قدر جلد اور سرعت کے ساتھ اسے بھلا دیا گیا۔ اور اب صورت یہ ہے کہ ماضی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا جاتا اور یہ نہیں سوچا جاتا کہ کیا کچھ کہا گیا تھا اور کیا کچھ کرنا ضروری تھا۔ آزاد پاکستان میں ایک مثالی ثقافت اور سماج پیدا کرنے کے لئے برصغیر کے مسلمان دماغوں نے جو غیر معمولی کوشش کی ہیں ان کی مثال عالم اسلام کے کسی دوسرے ملک کی تاریخ سے پیش نہیں کی جا سکتیں۔ چنانچہ اس کام سرسری اندازہ آپ کو اس کتاب کے مطالعہ سے ہوگا جس میں مسلمان اکابر و فضلاء نے جو بیک وقت مغربی علوم و معارف پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ علوم مشرقیہ کے بھی ماہر تھے، جدید تعلیمی نظریوں اور مسلمانوں کی اپنی ممتاز مذہبی و ثقافتی ضروریات کے پیش نظر ان کے عملی اطلاقات کے ہر پہلو پر بحث کی ہے۔ بطور مثال "نصب العین اور مقاصد تعلیم" کے عنوان ہی کو لے لیجئے۔ اس ضمن میں گیارہ فضلاء نے جن میں اکثر یورپ کی

یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مغربی تمدن کے پرانے شناسا اور کی حیثیت رکھتے ہیں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مغربی مفکروں کے اس سلسلہ میں کیا نظریات ہیں اور مسلمانوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان کا کس طرح اطلاق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے عنوانات پر جن میں تعلیم کے تقریباً سارے نظری و عملی پہلو آجاتے ہیں۔ اکابر کے خیالات اور فکری کاوشوں کا ایک تاریخی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ اس ذخیرہ میں ہماری موجودہ ثقافتی ضروریات کے لئے کافی مواد موجود ہے جس سے پاکستان کے نظام تعلیم کی تشکیل اور نصب العین متعین کرنے میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

زمانہ کے حالات اور واقعات کی نوعیت نے آج ان جوان پاروں سے قوم کو ناواقف بنا دیا ہے۔ اسی خیال سے یہ مختصر سا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں اکتیس مسلمان مفکرین اور انشاء پر واروں کے ان خیالات کو بالاختصار بیان کیا گیا ہے جو انہوں نے تعلیم اور اس کے اسلامی تقاضوں کے سلسلہ میں ظاہر کئے ہیں، اس میں آپ کتب خانوں کے قیام، اور اسکول کے بچوں کے طبی معائنے سے لیکر "ابتدائی ریاضیات کی قدر و قیمت"، "تعلیم نسواں"، "عربی فارسی کی تعلیم"، "اردو کی حیثیت"، "غرض ان تمام تعلیمی پہلوؤں پر برصغیر کے صفِ اول کے اہل علم و نظر کے خیالات پڑھیں گے جن سے ہم آج بھی دوچار ہیں۔ اور موجودہ عہد کے ہمارے پیچیدہ تعلیمی مسئلوں کے حل میں بے حد مفید بن سکتے ہیں۔

کتاب کے پہلے اور دوسرے باب میں اسلام اور تعلیم اسلام کے متعلق

ایک سیر حاصل جائزہ شامل کتاب کیا گیا ہے جس میں قرآن مجید کے اس رجحان پر بحث سے لیکر جو مسلمانوں میں ہمہ گیر تعلیمی سرگرمیوں کا سرچشمہ اور سبب اصلی بنا مختلف ادوار میں تعلیم سے متعلق مسلم حکومتوں اور امرار کی گہری دلچسپی کا قدرے تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ اس جامع پس منظر میں ان کوششوں کا بھی سرسری جائزہ لیا جاسکے جو مسلمانوں نے گزشتہ تقریباً ایک صدی میں کی تھیں۔

میری دلی دعا اور آرزو ہے کہ یہ کتاب اس جامع و مانع علمی و فکری ذخیرہ کی اشاعت کی ابتدائی کڑی بنے جو ہمارے اکابر نے جمع کر دیا ہے۔ اگر اہل علم اور ارباب نظر نے ہمت افزائی کی تو امید ہے کہ اس اہم قومی فرسٹ کی تکمیل جلد ہو جائے گی۔

زیر نظر مجموعہ مضامین کی ایک اہمیت اور بھی ہے جس نے اسے تاریخی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے اس مجموعہ میں پہلی بار حضرت علامہ اقبال کے "علوم اسلامیہ" اور "علم الانساب" پر دو خطوط ہیں جو جدا گانہ مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں اور تدوین نصاب کے سلسلہ میں علامہ مرحوم کے اختراعی طرز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اپنے فکر خیز مباحث کی وجہ سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔



آخر میں مجھے مرتب کتاب مولوی محمد حسین خاں صاحب زبیری ایم، اے (علیگ) کی سلیقہ شعاری کا اعتراف کرنا ہے کہ انہوں نے

کافر تسی اکیڈمی کے منصوبہ اور نخواستہ ہش کے مطابق ترتیب کتاب میں کافی کوشش و کاوش صرف کی اور ایک ایسی چیز تیار کر دی جو پاکستان کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کی تعلیمی راہ نمائی میں مفید ثابت ہوگی۔



مقدرا انسانی

تصنیف : ڈاکٹر. لی. کامت. دو۔ نوائے

ترجمہ : پروفیسر عبدالمجید قریشی

کسی معیاری کتاب کا ترجمہ ایک اونچی تصنیف و تالیف سے زیادہ مشکل کام ہے۔ مترجم کے لئے لازم ہے کہ جس زبان میں اصل کتاب ہے اور جس زبان میں اس کو منتقل کیا جا رہا ہے۔ ان دونوں کا ماہر ہو اور ساتھ ہی محبت کتاب پر بھی اس کو کامل عبور ہوتا کہ وہ مضمون میں ڈوب کر اس کی تہ سے کتاب کا جوہر نکال سکے۔ اور مصنف کا اصل مافی الضمیر زیادہ سے زیادہ سریع الفہم زبان میں دوسروں تک پہنچا سکے۔

مشہور زمانہ سائنس دان اور مفکر لی. کامت. دو۔ نوائے کی کتاب ”ہیومن ڈسٹنی“ (مقدرا انسانی) میں مصنف نے کائنات میں انسان کا صحیح مقام اور روئے زمین پر اس کے وجود کا مقصد متعین کرنے کے لئے بکثرت مادی و روحانی لاینحل مسائل کو سائنٹیفک طریق استدلال کے ذریعہ سلجھایا ہے۔ ان مسائل کو سمجھنا اور سمجھ کر دوسروں کو اردو زبان میں سمجھانے کے لئے ایک بڑے عالم و ادیب کی ضرورت تھی۔ استاد محترم جناب عبدالمجید قریشی

سابقہ پروفیسر ریاضی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی درخواست پر اس خدمت کے لئے تیار ہو جانا ایک ایسی خوش نصیبی ہے کہ اس پر جس قدر بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

مرسید اور محسن الملک کے بعد علی گڑھ میں بلند پایہ تصنیف و تالیف اور تراجم علمی کا کام قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے اکابر علم و فن کی قابلیت علمی کے دنیا میں یوں توڑنے کے بچتے رہے۔ لیکن کوئی ایسی بلند پایہ تصنیف جو ان کی نمایان شان ہوتی اور بقائے دوام حاصل کرتی معرض وجود میں نہ آسکی پروفیسر عبدالمجید قریشی بھی اسی اول درجہ کے اکابر علی گڑھ میں سے ہیں اور وہ لی افسوس تھا کہ تقریباً پچاس سال تک علم اور اہل علم کی ہمیشہ خدمت کے باوجود بھی کوئی کتاب اب تک نہ لکھ سکے تھے۔ لی بکامت۔ دو۔ نوائے کے عالمانہ ترجمہ نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اور جس طرح مصنف کا نام ہمیشہ باقی رہے گا اس کے فاعل مترجم کو بھی دنیا کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔



علم و عمل ————— وقائع عبدالقادر خانی

ترجمہ : مولوی معین الدین انفسل گڑھی

ترتیب و حواشی : پروفیسر محمد ایوب قادری

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی جانب سے ”علم و عمل ————— وقائع عبدالقادر خانی“ جلد اول کو زیور طبع سے آراستہ کر کے علمی دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں ہمیں غیر معمولی مسرت ہے۔ اس مسرت کی وجہ یہ ہے کہ کتاب کی اہمیت و افادیت کے ماسوا اس کے ساتھ چند در چند عزیز یادیں بھی وابستہ ہیں۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب ثروانی المحاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر کے سایہ عاطفت میں ۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۰ء حیات مستعار کے جو سب سے زیادہ قیمتی پندرہ سال گزرے اس کے لاتعداد اور گونا گوں فوائد میں سے ایک بہت بڑا فائدہ ان مرحوم و مغفور کے مشہور زمانہ کتب خانہ حبیب گنج سے استفادہ تھا۔

جہاں علی گڑھ شہر سے ۲۸ میل دور ریاست حبیب گنج میں ایک وسیع و عریض گڑھی، کوٹھی، محل سرائے اور پائیں باغ نواب صاحب کی شانِ امارت کے منظر تھے تو ان کے جذبہ دینی کی یادگار ایک حسین و جمیل مسجد بھی تھی جساتھ ہی

نواب صاحب نے اپنے ذوق علمی کی تسکین کے لئے گڑھی میں ایک بلند و بالا عمارت کتب خانہ کے لئے تعمیر کرائی تھی جس میں سات ہزار نادرا اور منتخب کتابیں جن میں سے اکثر قلمی تھیں کمالِ حسنِ ترتیب سے محفوظ کی گئی تھیں۔ کتب خانہ میں اہل علم و تحقیق کے قیام کے لئے متعدد آرام دہ کمرے تھے۔ صبح سے دوپہر تک کے اوقات نواب صاحب بہ نفس نفیس کتب خانہ میں صرف فرماتے۔ کتب خانہ کے مہتمم مولوی معین الدین صاحب افضل گڑھی مع اپنے ماتحت عملہ کے دن رات معروف کاررہتے اور تنگدانِ علم کو ان کی ضرورت کی کتابوں کی نشاندہی اور ان سے استفادہ کرنے میں مدد دیتے۔ حضرت نواب صاحب کی اجازتِ خاص سے کتابوں کی نقل اور ان کے ترجمے کا انتظام بھی ممکن ہو جاتا تھا۔

راقم نے متذکرہ سہولتوں سے امکان بھر فائدہ اٹھایا اور اٹھارویں

اور انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ اور علمی و تعلیمی تحریکات سے متعلق بکثرت کتابوں کے مطالعہ کے واسطے چند اہم کتابوں کو نقل و ترجمہ بھی کرایا۔ انھیں آخر الذکر کتابوں میں ”وقائع عبدالقادر خانی“ ہے جس کو باضابطہ نام ”علم و عمل“ جناب مولوی معین الدین صاحب افضل گڑھی نے میرے لئے فارسی سے اردو میں ترجمہ فرمادیا۔ ۳۰۴۲ کے بڑے سائز پر یہ کتاب چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

عزیزی و مجبی محمد ایوب قادری ایم۔ اے کے تشریحی و وضاحتی نوٹس نے مسودہ کو قریب قریب دو گنا کر دیا۔ لہذا کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ پہلا حصہ نذر ناظرین ہے۔ دوسرا حصہ اگلے سال پیش

کیا جائے گا انشاء اللہ! کتاب کس پایہ کی ہے؟ اور اس پر کس درجہ محنت
 صرف کی گئی ہے؟ اس سے معلومات میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے؟ اس کا اندازہ
 مطالعہ کرنے والے حضرات کو خود بخود ہو جائے گا۔ مگر پھر بھی اس کتاب کے
 ایک خاص علمی پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ مؤلف وقائع
 کو علم ہیئت و فلکیات پر بڑا تبحر حاصل ہے جس کی مثالیں کتاب میں جا بجا
 ملتی ہیں۔ باقی عطر مشک آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید۔



وقائع عہد القادر خانی

(از محمد ایوب قادری صاحب ایم، اے لکچرار اردو کالج کراچی)

یہ نادر و نایاب مخطوطہ نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم و مغفور کی معارف پروری اور علم دوستی کی بدولت ان کے مشہور زمانہ کتاب خانہ حبیب گنج (نلیگڈھ) میں محفوظ تھا۔ مرحوم نے اس کو دہلی میں ایک عالی خاندان متعمرخاتون سے حاصل کیا تھا۔ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۵۰ء راقم کو نواب صاحب سے قرب خاص کی سعادت نصیب ہوئی تو اس کے لاتعداد فوائد میں سے ایک فائدہ اس کتاب کی زیارت بھی تھا۔ میں نے اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر نواب صاحب کی اجازت سے کتاب خانے کے فاضل مہتمم جناب مولوی معین الدین صاحب افضل گڈھی سے اپنے لئے اس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کرایا۔ قیام پاکستان کے بعد جب میں کراچی آیا تو اس ترجمہ کو بھی اپنے ہمراہ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ عرصہ سے خیال تھا کہ اس کو زیور طبع سے آراستہ کرایا جائے مگر دو وقتیں حائل تھیں۔ اولاً کوئی لائق و مستند شخص اس کو اڑٹ کر دے۔ ثانیاً اس کے مصارف طباعت وغیرہ کا خاطر خواہ انتظام ہو جائے اس عرصہ میں خود عدیم الفرستی اور بے زری کا

حسب معمول شکار رہا۔

اللہ کا احسان ہے کہ ۶-۵۹ء کے مبارک سال میں یہ دونوں کاوشیں دور ہو گئیں عزیز رفیق کار محمد ایوب قادر مٹا ایم اے جن کے علمی و تحقیقی کارناموں سے ناظرین "العلم" باخبر ہیں کتاب کو اڈرٹ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے اس کو طبع کرنا منظور کر لیا۔

اصل کتاب ۲۰×۳۰ سائز کی تقریباً پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس کے بعد اس پر مفصل نوٹ لکھے گئے تو کتاب کی ضخامت بہت زیادہ ہو گئی۔ لہذا اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلا حصہ جو ۳۰×۲۰ یعنی "العلم" سائز کے ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

۱۵۔ اس کتاب کے دونوں حصے ان پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے طبع ہو چکی ہیں۔

اردو زبان اور اسالیب

تصنیف: سید محمد محمود رضوی مخدوم اکبر آبادی

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کی تحریک، اس میں شک نہیں مذہبی و ثقافتی اقدار، دو قومی نظریات اور سیاسی اختلافات کی بناء پر پروان چڑھی، لیکن جس چیز نے اس کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی اور بالآخر کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا وہ اردو زبان کے تحفظ و بقا اور اس کو غیر جنسی، نامالوس اور ملت کش اثرات کے مہجران سے مصنوں و مامون کے درجے تک پہنچا دیا وہ اردو زبان کے تحفظ رکھنے کا بے پناہ جذبہ تھا، جو برصغیر کے ہر حصہ میں پایا جاتا تھا۔

اردو کو جو بھارت میں ہر ولعزیز اور مقبول عام ہونے کے باوجود حکومت کی بے اعتنائی اور ایک بڑے طبقہ کی کھلم کھلا مخالفت کے زیر اثر "مظلوم اور یتیم" سمجھی جانے لگی تھی قیام پاکستان کے باعث اب ترقی کرنے اور پروان چڑھنے کا موقع مل گیا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس مملکت خدا واد میں جو ملی اور قومی نظریات و منقذیات کے احترام اور تکمیل کے لئے عالم وجود میں آئی ہے اردو کو اس کا جائز منصب اور واقعی حق مل چکا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کو اپنی قدرتی صلاحیتوں کو ابھارنے اور قدر دانانِ اردو کو اس

کی ترقی اور وسعت میں بیداریغ کوشش کرنے کے لئے ایک وسیع میدان مل گیا ہے۔

بدقسمتی سے ہماری قوم اب تک غلامانہ ذہنیت سے نجات حاصل نہیں کر سکی ہے، جس کا سب سے زیادہ مہلک اثر یہ ہو رہا ہے کہ تعلیم، ادب اور بالخصوص زبان کے معاملے میں ہمارا احساس کمتری کم ہونے کے بجائے زیادہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اردو کو اپنانے اور اس کی مقبولیت و افادیت کو تسلیم کرنے میں بھی یہی چیز سنگ راہ ثابت ہو رہی ہے۔ نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ایک عام اعتراض یہ ہے کہ اس زبان کا نہ کوئی سائنٹیفک رسم الخط ہے نہ اس کے قواعد و اسالیب منضبط ہیں نہ اس کی کوئی اپنی فلا لوجی ہے، ادبی علمی سرمایہ تو ایسی بے مایہ زبان میں ہو ہی کیا سکتا ہے۔ جس میں ہر قسم کے اٹھل بے جوڑ محاورات اور دوسری زبانوں سے لئے ہوئے الفاظ کی بھرمار ہو۔ یہ تو وہ مانتے ہیں کہ قومی سالمیت اور اتحاد ملی کے لئے ایک واحد زبان کا ہونا ہر قوم کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر کوئی قوم قوم نہیں کہی جاسکتی۔ اور نہ قومی اتحاد کی داغ بیل پڑ سکتی ہے۔ لیکن ان کے خیال میں اردو پاکستان کی قومی زبان بننے کی پوری صلاحیت ابھی نہیں رکھتی اس کے مقابلے میں انگریزی زبان آسانی سے قومی و ماوری زبان کی جگہ لے سکتی ہے۔ اب یہ دعویٰ بھی کیا جا رہا ہے کہ مذہبی زبان ہونگی بنا پر عربی، اردو سے زیادہ ملک کی قومی زبان بننے کا استحقاق رکھتی ہے۔

اردو کی ساخت اور تدوین کا جہاں تک تعلق ہے اس کی نوعیت اور اس کے ارتقا پر نظر غائر ڈالنے سے یہ امر بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس زبان

کی تشکیل بعض ناگزیر حالات اور سماجی، معاشی و عمرانی عوامل و رد عمل کے تحت وقوع پذیر ہوئی۔ ان ہی اثرات کے پیش نظر اس زبان میں مختلف قدیمی اور عصری زبانوں کے لاتعداد الفاظ و محاورات داخل ہوتے چلے گئے جنکو نہ تو نقد و احتساب کی کسوٹی پر جانچا گیا نہ ان کے معانی و مطالب کا تعین ہو سکا، اس کی توقع ہی نہ تھی کہ زبان اور اسلوب زبان اور صرف و نحو کے متعلق صحیح قواعد و ضوابط مرتب کئے جائیں۔ سیاسی حالات نے مسلمان بادشاہوں نوابوں اور امراء کو اردو کی سرپرستی پر مجبور کیا۔ اور اس کو تقرب سلطانی کا ایک کامیاب وسیلہ بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کا شعری سرمایہ غزل، قصیدہ وغیرہ کی شکل میں سرعت سے بڑھتا رہا۔ لیکن زبان کی ساخت و تعمیر اور ٹکنیک کی طرف لوگوں کی بہت کم توجہ ہوئی یہاں تک کہ اردو کی نثر بھی خصوصیت سے اس کی شاعری کا ساتھ نہ دے سکی۔ اور کئی صدی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے برصغیر میں قدم جانے کے بعد اور خود انگریزوں کی کوشش اور سرپرستی کے زیر اثر اردو نثر کے ارتقا اور اس کو ایک علمی زبان بنانے کی داغ بیل پڑی جس میں برگ و بار سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی اٹھک کوششوں سے پیدا ہوئے۔

ان حالات میں اگر بھی خواہاں اردو کو قواعد زبان اور صرفی و نحوی اصول کے مبادیات متعین کرنے، املا اور تلفظ کی بحث اٹھانے اور اس میں آسانیاں پیدا کرنے اور علم اللسان کے اصول کے مطابق زبان کو ڈھالنے کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا تو یہ فرد گزاشت قابل گرفت نہیں ہے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان حالات میں بھی بعض مشہور علمائے ادب اردو نے اس اہم صنف ادب کو

تشنہ نہیں چھوڑا۔ گو ملک و قوم کے نئے سیاسی اور فنی ارتقا کے زیر اثر اور خود اردو کی ہمہ جہتی ترقی کے نتیجے میں اسالیب، معانی اور بیان میں جو تغیرات پیدا ہوئے ہیں اور متر و کلمات و محذوفات کی جو طویل فہرست اساتذہ کے اسناد سے اردو زبان میں تیار ہو چکی ہے، ان کے پیش نظر متذکرہ علمائے ادب کی بلند پایہ تصانیف بھی "اوراقِ پارنیہ" شمار ہونے لگی ہیں۔

یہ امر موجب امتنان ہے کہ ہمارے لائق احترام بزرگ سید محمد محمود غفوی مخمور اکبر آبادی نے زیر نظر کتاب "اردو زبان اور اسالیب" لکھ کر اس کمی کو پورا کیا۔ اور گویا اردو کی پرانی دیوار کو لونی لگنے اور گرنے سے بچا لیا۔ مخمور صاحب حضرت دلگیر اکبر آبادی مرحوم، مولانا نیاز فتحپوری۔ ل۔ احمد اکبر آبادی اور حضرت جوش ملیح آبادی جیسے اساتذہ ادب کے قریب قریب ہم عصر اور برابر کی ٹکر لینے والے ادیب و نقاد ہیں۔ زبان و بیان کے مروجہ مسامح اور اغلاط پر وہ شکرہ کی طرح جھپٹتے ہیں اور بلا لومہ لائم ان کا تجزیہ کر ڈالتے ہیں۔ انگریزی دور اور دو علم اللسان میں ان کا مطالعہ اور معلومات بے پناہ ہیں۔ بڑے بڑے لکھنے والوں کی شاہکار تحریروں کے وہ نیچے ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں، لیکن اس خصوص میں زبانی تلخ نوائی کے بعد ان کی تحریروں میں بلا کی شیرینی اور تہذیب لفظی نظر آتی ہے۔ ان کی ضخیم مجلدات میں کوئی ایک فقرہ اور جملہ بھی ایسا نظر نہ آئے گا جو مذاق سلیم پر بار ہو یا کانوں کو ناگوار ہو۔ پختہ و لائل و براہین اور ادائے مطالب کے لئے صاف ستھری شوخ عبارت ان کا طرہ امتیاز ہے۔ مخمور صاحب متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف مؤلف اور مترجم ہیں۔ مضامین اور تحقیقی مقالات لا تعداد لکھ چکے ہیں۔ ان کی لکھی

ہوئی ہر چیز معیاری ہوتی ہے۔ اور لسانی تحقیق پر یہ کتاب "اُردو زبان اور سالیب" جس کی چار سو صفحات کی پہلی جلد اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی شائع کر رہی ہے۔ جناب مخمور صاحب کی شاہکار کتاب ہے۔ مدت العمر کی ریاضت شاقہ کا حاصل اور ان کے علم و فن کا عطر ہے۔ جس کی خوشبو سے توقع ہے کہ ملک کے طول و عرض میں اہل علم کا مشام جان معطر و مخطوط ہوگا۔

ممکن ہے بعض نقاد ان فن مخمور صاحب کے نقطہ نظر اور افکار و آراء سے متفق نہ ہوں۔ لیکن ان کے لئے بھی کتاب اس لحاظ سے مفید ثابت ہوگی کہ لسانی ترقی کے موجودہ سائنسی دور میں تحقیق کا ایک نیا باب کھلے گا، اور اہل تحقیق کی مخالفت و موافق کاوشوں کے نتیجہ میں ہمارے ہر ماٹھ ادب میں بیش قیمت اضافہ ہوگا۔

پاکستان کے سرآمد اہل علم جناب ممتاز حسن صاحب سابق سکریٹری فنانس گورنمنٹ آف پاکستان کے عالمانہ مقدمہ نے اس کتاب کی قدر و قیمت اور افادہ میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ یہ دراصل آں محترم ہی کی نکتہ رسی اور تحریک و تشویق کا نتیجہ تھا کہ کانفرنس اکیڈمی نے بصر ف کثیر اس کتاب کی طباعت و اشاعت کی خدمت کو اپنے ذمہ لیا۔ کیونکہ جس چیز کو جناب ممتاز حسن صاحب کی نظر کیمیا اثر پسند کر لے اس کے پسندیدہ ہونے میں پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی

توقع ہے کہ نقادان فن کتاب کو اسی قد و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے جس کی کہ وہ مستحق ہے۔ اس سے نہ صرف طلباء استفادہ کریں گے بلکہ اساتذہ بھی کما حقہ فائدہ اٹھائیں گے۔ آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ جن مقاصد عالیہ کے تحت یہ صحیفہ ادب تیار ہوا ہے۔ وہ بدرجہ اتم ثمر قبولیت حاصل کرے۔ آمین!

ذکر و فکر

(تصنیف: سیدہ انیس فاطمہ بریلوی)

سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کے رسعات قلم بعنوان "تاثرات" العلم میں مسلسل شائع ہو کر حد درجہ مقبول ہوئے ہیں کیونکہ بقول اخبار "علیگڑھ" یہ ایسے نفسیاتی جواہر پارے ہیں جو علاوہ دل چسپ و مفید ہونے کے سوسائٹی کے ایک خاص پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان تاثرات کی بنیادیں چونکہ آنکھوں دیکھے ایسے واقعات پر قائم ہیں جن سے لکھنے والے نے خود اثر لیا ہے اس لئے وہ پڑھنے والے کے دل کو بھی براہ راست متاثر کر دیتے ہیں۔

"تاثرات" کی اسی مقبولیت و افادیت کے پیش نظر ان کو کتابی شکل میں "ذکر و فکر" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ سیدہ انیس فاطمہ کی یہ دوسری مطبوعہ تصنیف ہوگی، اس سے قبل ان کی مشہور کتاب "شہر کے ہیرو" کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۱۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ایزادی مضامین "تاثرات و مشاہدات" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ ۲۔ ایک اور کتاب "ادب منزل بمنزل" کے نام سے طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ ناشر، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

ایک تیسری کتاب بھی زیر ترتیب ہے جو اُن کے درج ذیل معاشی

و اصلاحی مضامین و مقالات کا مجموعہ ہوگا۔

- ۱۔ یہ فلاکت تاکے ؟
- ۲۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا۔
- ۳۔ پاکستان میں آباد کاری کا مسئلہ۔
- ۴۔ ہمارا معاشی مسئلہ۔
- ۵۔ کولمبو پلان۔
- ۶۔ نیا دستور اور خاتمہ زمینداری و جاگیرداری۔
- ۷۔ پاکستان کا اسلامی آئین اقتصادی اور معاشی پہلو پر ایک نظر۔
- ۸۔ پاکستان کا سالانہ بجٹ۔
- ۹۔ یہ زمین کس کی ہے ؟
- ۱۰۔ انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء کا معاشی پس منظر۔

ان عنوانات سے کتاب کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے
انیس فاطمہ کی تحریریں خلوص اور سچائی کی حامل ہوتی ہیں۔ وہ جو کچھ
لکھتی ہیں تفصیلی مطالعہ، عمیق غور و فکر اور محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہمارے
ملک میں سنجیدہ اور اذوقِ مباحث پر بہت کم خواتین قلم اٹھاتی ہیں حالانکہ
دیگر ممالک میں تاریخ، فلسفہ، سائنس، معاشیات اور ریاضیات وغیرہ،
پر لکھنے والی خواتین کی بڑی کثرت و بہتات ہے۔ کئی ایک کو نوبل پرائز بھی
مل چکا ہے، ہمیں توقع ہے اہل ملک بیدہ انیس فاطمہ کی خدمات کی خاطر خواہ
قدر دانی کریں گے۔

یہ کتاب "پاکستان کا معاشی پس منظر" کے نام سے آں پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب
سے شائع ہو چکی ہے۔

حکیم عمر خیام

تصنیف روسی زبان میں : از مسٹر ڈیوڈ سو سکی ۔
(سر ڈینین راس کے انگریزی ترجمہ سے اردو ترجمہ)
از ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی

عمر خیام سلجوقی عہد سلطنت کی ایک تاریخی شخصیت ہے، یہ عہد اسلامی عظمت و بزرگی کا آئینہ دار ہے۔ عباسیوں کے سیاسی زوال نے جب عالم اسلامی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تو یہ سلجوق ہی تھے جنہوں نے عالم اسلامی کو سیاسی انتشار و پراگندگی سے نکال کر اتحاد و یگانگت کی نئی روح عطا کی، اور اس کی کھوئی ہوئی عظمتوں کو از سر نو حاصل کر کے ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی جس نے تہذیب و تمدن، علم و فضل، دولت و ثروت، روحانیت و اخلاق کی قدروں کو بلند کیا اور مسلمانوں کو وہ سب کچھ بخشا جو وہ اپنے افتراق و اختلاف سے کھو چکے تھے اس لحاظ سے عہد سلاجقہ کی تاریخ کو اسلام کی تاریخ کے ایک روشن باب کے عنوان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

عین اس زمانہ میں جبکہ عربوں کے خلاف عجمی اسپرٹ جنم لے رہی تھی اور عربی و عجمی عصبیت آمین و مآمون کی صورت میں دست و گریبان تھی اور یہ

بیماری گھن کی طرح عباسی سلطنت کو کھائے جا رہی تھی کہ معتصم خلیفہ ہوا اس نے اس بیماری کا علاج یہ سوچا کہ ان کے خلاف ایک تیسری قوت کو کھڑا کیا جائے جو ضرورت کے وقت عربوں اور عجمیوں کو دبانے میں سلطنت کے کام آسکتی ہو۔ اس نے ترکی غلاموں کی ایک فوج مرتب کر کے اس عصبیت کو دبانے کی کوشش کی جو سلطنت عباسیہ کو تباہی کے غار کی طرف ڈھکیل رہی تھی۔ لیکن معتصم کے بعد یہ فوج خود عباسیوں کے لئے خطرہ بن گئی اور ایک صدی کے عرصہ میں یہ ترکی غلام عباسی حکومت کے مالک بن گئے وہ جسے چاہتے خلیفہ بناتے اور جسے چاہتے خلافت سے علیحدہ کر دیتے، متوکل انھیں کے قتل کا نشانہ بنا مستعین اس قدر پریشان ہوا کہ اُس نے بغداد سے ساہرا بھاگ جانے میں عافیت سمجھی اور اُن کے بلانے پر جب وہ نہ آیا تو انھوں نے اس کو خلافت سے معزول کر کے قتل کر دیا۔ قہدمی کو انہوں نے قید کر دیا۔ قساہر کو معزول کیا اور متقی کو اندھا کر کے علیحدہ کیا۔ مرکزی حکومت کے اس انتشار نے گورنروں کے دل میں خود مختاری کی ہوس پیدا کی خراسان کے گورنر طاہر بن عبد اللہ نے سب سے پہلے ۲۳۰ھ میں خود مختاری کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد ۲۵۲ھ میں احمد بن طولون مصر کا گورنر اس راہ پر گامزن ہوا۔ اور اُس نے مصر و شام میں ایک خود مختار ریاست قائم کر لی۔

تیسری صدی ہجری کے وسط میں یعقوب بن لیث ٹھٹھیرے کے دل میں مرکزی حکومت کے انتشار کو دیکھ کر حکومت کی خواہش پیدا ہوئی اُس نے سیستان پر قبضہ جایا۔ ۲۵۹ھ میں اُس نے طاہریوں سے خراسان چھین کر

فارس اور طبرستان تک اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کی حکومت حکومت صفاریہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

ولیم، طبرستان اور گیلان پر حسن بن زید علوی نے قبضہ کر کے ان علاقوں کو عباسیوں سے منقطع کر دیا۔

ماوراء النہر میں سامانی خاندان نے اپنی حکومت کا علم بلند کیا یہاں تک کہ انہوں نے ۲۶۱ھ میں دوبار خلافت سے ماوراء النہر کی حکومت کا پروانہ حاصل کر لیا۔

یہ سب کچھ صوبوں میں ہو رہا تھا کہ مرکز میں الراضی بالله ۳۲۲ھ — ۳۲۹ھ (۹۴۰ء) برسر اقتدار آیا۔ یہ اس شان کا خلیفہ تھا کہ اس کی حکومت بغداد اور اس کے مضافات کے سوا کہیں نہ تھی۔ محکم نے اس کی اس گئی گزری خلافت کو بھی مجروح کر دیا۔ اور وہ جوڑ توڑ ملا کر امیر الامراء کا خطاب حاصل کر کے خلافت پر اس طرح مستولی ہوا کہ خلیفہ کی حیثیت ایک وظیفہ خوار کی رہ گئی۔ آخر میں عباسی خلفاء کی بیچارگی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کی حکومت قصر خلافت تک محدود ہو کر رہ گئی۔

عباسیوں کا آفتاب خلافت ابھی پوری طرح گہن میں نہ آیا تھا کہ شمالی افریقہ سے ایک اور طوفان اُٹھا جس نے عباسی حکومت کی رہی سہی تاب و توالی کو بھی چھین لیا۔ یہ فاطمی خاندان تھا جس نے مصر کو فتح کر کے چند سال بعد شام اور حجاز کو بھی اپنے حیطہ اقتدار میں لے لیا۔ یہاں تک کہ مکہ اور مدینہ میں عباسیوں کے بجائے فاطمیوں کا خطبہ پڑھا گیا۔ عباسیوں کے عالم نزع کی،

آخر میں یہ کیفیت تھی کہ ایسا سیری نے ۲۵ھ میں بغداد پر قبضہ کر لیا اور جامع بغداد میں مستنصر عبیدی کا ایک سال تک خطبہ پڑھا گیا۔

عباسیوں کے اس زوال نے عالم اسلامی کو زیر و زبر کر رکھا تھا۔ یاس کی گھٹائیں ہر طرف چھائی ہوئی تھیں۔ رہی سہی مسلم حکومتیں آپس کی چپقلش میں مبتلا تھیں۔ مسلمانوں کے فکر و عمل، اخلاق و عادات، کردار و اطوار پر انحطاط پورے طور پر چھار ہا تھا کہ یاس کے اس گھٹا ٹوپا اندھیرے میں امید کی ایک اور کرن پھوٹی۔ یہ غزنویوں کے بعد سلجوقیوں کی حکومت تھی۔

یہ شرف قدرت نے سلجوقی خاندان کے مقدر میں لکھا تھا کہ وہ مسلم قوم کی گرتی ہوئی دیوار کو تھام لے اور ان کی عظمت رفتہ کو واپس دلائے۔ سلجوقی پانچویں صدی کی ابتداء میں برسر اقتدار آئے۔ ملک گیری کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے یہ نواح بخارا کے میدانوں میں اسلام قبول کر چکے تھے ان کا چھوٹا سا قبیلہ ایک عرصہ تک ترکستان سے نکل کر مارا مارا پھرتا رہا۔ ابتداء میں اسکی بیکسی اور بے بسی کا یہ عالم تھا کہ کبھی محمود غزنوی اس کو نکال دیتا کبھی وہ خود خوارزم کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے۔ غرض کہ کہیں دنیا میں ان کا ٹھکانہ نہ تھا، آخر سلجوقیوں نے ۲۲۹ھ میں خراسان کی طرف پیش قدمی کی اور غزنویوں کو خراسان سے بیدخل کر کے ان کے ایک سردار طغرل بیگ نے خراسان کی بادشاہی کا اعلان کیا آخر ایک دن وہ بھی آیا کہ انھیں خانہ بدوش سلجوقیوں نے غزنوی حکومت کے عالی شان قصر کو منہدم کر کے رکھ دیا۔

۱۰۶۲ء سے ۱۰۹۲ء تک سلجوقیوں کا وہ دور ہے جسے ان کے

زریں عہد سے تعبیر کیا جاسکتا، یہی وہ زمانہ ہے جس میں الپ ارسلان اور ملک شاہ ... جیسے مدبر فرما نروا برسر اقتدار آئے اور انھیں نظام الملک طوسی جیسا، عقلمند و دراندیش وزیر ملا، ان دونوں بادشاہوں اور وزیر نے ملکر اپنی تدبیروں اور حکمت عملی سے سلجوقی سلطنت کو جس عروج و کمال پر پہنچایا اس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔

اچھی حکومت جہاں عوام پر سیاسی، تمدنی اور سماجی ترقی کی راہیں کھولتی ہے وہیں اس کے دامن میں علوم و فنون پرورش پاتے ہیں یہی حال سلجوقیوں کے عہد حکومت کا تھا۔ انھوں نے اپنے حسن انتظام سے جہاں عوام پر فلاح و بہبود کے دروازے کھولے وہیں ان کی معارف پروری نے اسلامی علوم و فنون کی شمع روشن کی، علماء کی قدر افزائی کی، تعلیم کو عام کیا، جس کی وجہ سے ان کی مملکت میں علوم و فنون پھیلے اور علماء اور اہل ہنر نے ان کی قدر و ثناء سے مطمئن ہو کر اپنے کو علم و فن کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

سلجوقیوں کے دور میں گلستانِ علم میں جو بہار آئی اور سدا بہار پھول کھلے ان میں امام غزالی، عبد الکریم شہرستانی، ابوالحسن خرقانی، ابوبکر شاشی، اثیر الدین ابہری، راغب اصفہانی، ابواسحاق شیرازی، خواجہ قطب الدین مودودی، ابو القاسم مشیری، شیخ شہاب الدین سہروردی، عبد القادر جرجانی اور عمر خیام جیسے وہ گل سرسید ہیں جنکی خوشبو اور زینکت آج بھی اہل نظر کے مشام جان کو معطر بنائے ہوئے ہے۔

جناب ابوالکارم سلیم اللہ صاحب فہمی نے ان میں سے عمر خیام کو منتخب

کر کے اپنی اس کتاب کا موضوع خاص بنایا ہے

غیاث الدین ابوالفتح عمر بن ابراہیم خیام گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں نیشاپور میں پیدا ہوا، یہ اپنے زمانہ کا جید عالم، سائنس دان اور ماہر علم ہیئت تھا۔ خیام نے اپنے وقت کا بڑا حصہ علوم و فنون کی خدمت میں صرف کیا۔ شاعری کی حیثیت اس کے یہاں ثانوی تھی۔ یعنی تفتن طبع اور تنوع کے لئے وہ اپنے فرصت کے اوقات میں شعر بھی کہتا تھا۔ ورنہ اس کی ساری توجہ علم ہیئت نجوم اور ریاضی پر مرکوز رہی۔ ملک شاہ کے دور حکومت میں اس نے کلنڈر میں اصلاح کی اور سلجوقی عہد حکومت کے اعتبار سے اس نے ۱۰ مارچ ۱۰۶۹ء سے نیا سال شروع کیا۔ خیام کی شہرت اس کی زندگی میں بحیثیت ماہر سائنس و ریاضیات کے ہوئی، وہ اپنی زندگی میں بحیثیت شاعر کے شہرت نہ پاسکا اس کی وفات کے بعد بھی اس کی شاعری پر کسی نے توجہ نہ دی یہاں تک کہ اس کی ساری تصانیف ناقدریٰ روزگار کا شکار ہو کر رہ گئیں۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ زمانے کی بے اعتنائی کی وجہ سے اس کے حالات زندگی بھی گوشہ گمنامی میں رہے۔

۱۸۵۹ء میں جب فطر جیرالڈ نے رباعیات عمر خیام کا آزاد ترجمہ کر کے اور اس کی مختلف رباعیوں کو ایک نیا تسلسل دے کر ایک طویل نظم کی شکل میں انگریزی میں پیش کیا تو مغرب اس کے شاعرانہ کمال کے اعتراف سے گونج اٹھا اور پہلی مرتبہ بحیثیت شاعر دینا خیام سے روشناس ہوئی اور اس کے نام کو ثبت دوام حاصل ہوا۔

غالب نے اپنی فارسی شاعری پر فخر کرتے ہوئے کہا ہے

فارسی میں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ

بگذرا ز مجموعہ اُردو کہ بے رنگ من است

لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اسی مجموعہ بے رنگ نے ان کی شہرت

کو چار چاند لگائے بعینہ یہی معاملہ عمر خیام کے ساتھ ہوا۔ وہ جن علوم و فنون

کی خدمت میں عمر بھر مصروف رہا وہ اس کے نام کو آگے نہ بڑھا سکے، لیکن جس چیز

نے اس کو آسمان شہرت پر آفتاب بنکر چمکایا وہ اس کی شاعری تھی جس کو اس نے

اپنی زندگی میں کبھی اہمیت نہ دیا تھی۔

خیام نے ۱۱۲۳ء میں وفات پائی کہتے ہیں کہ اس نے اپنی وفات سے پہلے

پانچ سو سے زیادہ رباعیاں لکھی تھیں۔ لیکن ہم تک یہ رباعیاں بہت کم پہنچی ہیں۔ اس

کی شاعری کا موضوع خاص لذتیت ہے، وہ عیش و نشاط و کامرانی کو زندگی کا

حاصل سمجھتا ہے، شاید اسی کے فلسفہ سے متاثر ہو کر بابر نے کہا تھا

بابر بعیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست

اس مختصر سی کتاب میں جس طرح عمر خیام کے حالات زندگی کا جائزہ لیا

گیا ہے اور جس طور پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اسے دیکھ کر کوزے میں دریا کو

بند کرنے کی مثل یاد آتی ہے۔ فاضل مترجم ایک کہنہ مشق ادیب ہیں، آپ کی

تحریر میں سلاست و روانی اور جامعیت ہوتی ہے جس کا یہ کتاب ایک بین ثبوت

پیش کرتی ہے۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

جناب فہمی صاحب کی شکر گزار ہے کہ طباعت و اشاعت کے جملہ حقوق آپ نے

بلا معاوضہ مرحمت فرمائے۔ آپکی یہ معارف پروری ہمیشہ یاد رہے گی۔

شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ

اور

ان کی تعلیمات

تالیف: مولانا اعجاز الحق قدوسی

مولانا اعجاز الحق قدوسی کو دیکھ کر بیساختہ تبدیل کا یہ مصرع ذہن کے
دڑپوں سے جھانکنے لگتا ہے۔

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباحث
وہ دیوانہ وار صبح سے شام تک حصول علم میں لگے رہتے ہیں۔ کتابوں کے
پلندے لے شہر کے مختلف کتب خانوں میں آتے جاتے نظر آتے ہیں، ذرا سی
بات ہوگی اس کے لئے تحقیق کا حق ادا کر دیں گے، وہ سچے آدمی ہیں، بات
کریں گے تو پھول جھڑیں گے، چھوٹوں میں بیٹھ کر چھوٹے اور بڑوں کی صحبت
میں بردبار اور بڑے، اسی لئے وہ ہر جاہ رونق محفل بن جاتے ہیں خوش خلقی،
وضع داری اور شرافت ان کا چلن ہے۔ وہ پیدائش سے لیکر اب تک مرف طالب علم

ہیں۔ اور اسی خصوصیت نے ان کے ذہنی ارتقا کو کسی منزل پر بھی آگے بڑھنے سے نہیں روکا ایک تصنیف کے بعد دوسری اور پھر تیسری جیب خالی، پیٹ خالی، لیکن علم کی لگن میں ایسے لگن کہ کسی بات کا ہوش نہیں، فناعت مزاج اور توکل تکبیر، مجتہم علم، جوڑ توڑ سے متنفر، سیاست کے پیچوں سے دور۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے ہیں، ۱۹۰۵ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ چشتیہ کے نامور صوفی شیخ

عبدالقدوس گنگوہی کی اولاد سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اس زمانہ کے رواج کے مطابق

اپنی نانہال قصبہ اہلیٹھ، ضلع سہارن پور میں مولانا شفیق احمد صاحب انڈیوی سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک مدرسہ مجددیہ ہند میں تعلیم پاتے رہے۔ اور پھر

علوم مشرقیہ کی تکمیل ہندوستان کی مشہور دینی درس گاہ مظاہر العلوم

سہارن پور سے کی۔ مولانا خلیل احمد محدث راجہ شیخ الحدیث مولانا ذکر یا صاحب

کاندیلوی، مولانا اسد اللہ رامپوری، مولانا عبدالرحمن کیمیل پوری، مولانا ثابت

علی مرحوم، اور مولانا منظور احمد سہارنپوری جیسے یگانہ روزگار علماء سے نہ صرف

تعلیم حاصل کی بلکہ ان بزرگوں کی خدمت میں رہ کر اپنے جوہر قابل کو نکھارا۔

۱۹۲۸ء میں حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہاں ۱۹۵۱ء تک محکمہ امور

مذہبی سے وابستہ رہے۔ یہیں ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اپنی سب سے پہلی

کتاب ”مسلمان بیبیاں“ کے نام سے لکھی۔ جسے مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے شائع

کیا۔ اس کتاب کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی

مقبولیت کے بعد انہوں نے اسی طرح کی کتابیں سراپائے رسول، رسول پاک

کی عما جزادیاں، پاک بیبیاں، سیرت تبولؐ، عہد رسالت کے دو بچے، در سگاد رسولؐ کے دو طالب علم، ہمارے نبی کے صحابہ، خلفائے راشدین کی عما جزادیاں، رسول اللہ کے دو محبوب، سیرت امام حسن رضا جیسی مقبول عام کتابیں لکھیں، یہ سب کتابیں تاریخی اعتبار سے ایک خاص ندرت لئے ہوئے ہیں۔

جن مشاہیر کے تعلقات نے ان میں لکھنے کا شعور پیدا کیا، ان میں ایاس احمد مجیبی، خواجہ حسن نظامی، جوش ملیح آبادی، مولانا عبداللہ العما دی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید حسام الدین راشدی ہیں، وہ کہا کرتے ہیں کہ ایاس احمد مجیبی مرحوم نے مجھے سب سے پہلے لکھنے کے ذوق سے آشنا کیا میں نے ان کو کتابیں لکھتے ہوئے دیکھ کر خود کتابیں لکھنا شروع کیں۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم کی نیاز مندیوں نے مجھے کام کی لگن کا درس دیا۔ جوش صاحب کی صحبتوں نے مجھے شعر کا صحیح عرفان بخشا، مولانا عبداللہ العما دی کے تعلقات نے مجھے بتایا کہ انسان کو اپنی آخری عمر تک خود کو طالب علم ہی سمجھنا چاہیے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کرم فرمائیوں نے مجھے تحقیق کا ذوق عطا کیا، اور سب سے آخر میں سید حسام الدین راشدی کے لطف و کرم نے مجھ پر لکھنے کی نئی راہیں کھولیں۔ میں ان سب کو اپنا استاد معنوی کہتا ہوں۔“

مولانا اعجاز الحق قدوسی اگرچہ علمی و ادبی حلقوں میں بحیثیت شاعر کے بہت کم متعارف ہیں، لیکن وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں رنگینی، کیف اور ندرت خیال کا ایک دل کش اور حسین امتزاج برتا ہے وہ اپنی شاعری میں جوش سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ جب کبھی کوئی

ان سے ان کی غزل یا نظم چھاپنے کی فرمائش کرتا ہے تو وہ نیم تبسم کے ساتھ ہمیشہ یہ جواب دیتے ہیں کہ میری یہ کج بیانی تو صرف دوستوں کی گرمی محفل کے لئے ہے ورنہ میں تو تاریخ اور اسلامیات کیلئے بنا ہوں۔

زوال حیدرآباد کے بعد وہ پاکستان چلے آئے اور سندھی ادبی بورڈ کراچی کے شعبہ تاریخ سے وابستہ ہو گئے اس ادارے سے وابستہ ہو کر سندھی تہذیب و ادب کا ایسا چسکا پڑا کہ سندھ کی تاریخ و ادب کا مطالعہ شروع کر دیا اور کچھ عرصہ بعد ”سندھ کی تاریخی کہانیاں“ کے نام سے ایک ایسی کتاب تحریر کی جو نہ صرف حد درجہ مقبول ہوئی بلکہ اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ”تذکرہ صوفیائے سندھ“ کے نام سے ان تمام صوفیائے کرام کا تذکرہ قلم بند کیا جو سرزمین سندھ میں پیدا ہوئے اور جن کے فیوض و انوار سے اسلام کی جڑیں یہاں گہری ہو گئیں۔ یہ تذکرہ بھی اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے، قدوسی صاحب کے انداز بیان اور زاویہ نظر نے اس میں اور جان ڈالی۔

یہ کتاب سندھ میں تصوف کے ارتقاء کی ایک ایسی تاریخ ہے جو اہل علم اور شائقین تصوف کے لئے فکر و نظر کے نئے راستے کھولتی ہے ”تذکرہ صوفیائے سندھ“ بھی ان کی اور کتابوں کی طرح بہت مقبول ہوئی۔

اس کے بعد انھوں نے اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی فرمائش پر ”شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات“

سے آج کل قدوسی صاحب اردو ویلیمنٹ بورڈ سے متعلق ہیں (بریلوی)

کے نام سے کتاب پیش کی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف حضرت شیخ کی سوانح حیات ہے بلکہ سلسلہ چشتیہ صابریہ کی عہدِ حاضر تک مستند تاریخ بھی ہے، حاشیوں نے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ یہ کتاب تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور دسویں صدی ہجری کی ان تمام تحریکوں اور عوامل کو سامنے لاتی ہے جن میں حضرت شیخ نے رُشد و ہدایت کی شمع روشن کی۔

آج کل مولانا اعجاز الحق قدوسی برصغیر پاک و ہند کی تاریخ تصوف کے مختلف گوشوں پر کام کر رہے ہیں۔

ان کی ہمت اور حوصلہ کو دیکھ کر اس بندھتی ہے کہ ابھی ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ باقی ہیں جو نامساعد حالات کے باوجود اپنے کاموں میں منہمک ہیں، خدا انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے۔

خزاں کے جور سے ہر چند خار ہیں یہ لوگ
مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں یہ لوگ



مسلمانوں کا نظام تعلیم

(طبع ثانی)

(تالیف :- پروفیسر سعید احمد رفیق)

فلاسفہ یونان کی رائے میں تعلیم ایک فن ہے جس کا مطلق نظریہ دوسرے فنون کی طرح قوم، معاشرہ اور فرد کی اصلاح و بہبود ہے۔ لیکن دیگر فنون کے مقابلے میں تعلیمی فلاح کا وسیع و امن بہت سی ذہنی اور اخلاقی نعمتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ تعلیم کا اولین مقصد یہ ہے کہ انسانی کردار کی صحیح تشکیل کر کے فرد کو ایک مکمل اور مثالی زندگی کا اہل بنا دے۔ نیز ہر صحت و جسم میں صحت مند و باغ کی نشوونما کر کے پورے معاشرہ کی تزئین و تہذیب کے اسباب بنیاد بنائے۔ تعلیم کا صحیح نصب العین یہی ہے لیکن اس نصب العین کا حصول اس وقت قابل عمل ہو سکتا ہے جبکہ قوم کا نظام تعلیم قومی تقاضوں اور معاشرے کے ماحول و مزاج سے نہ صرف ہم آہنگ ہو بلکہ قوم و افراد کی اُمنگوں اور آرزوں کی منزل تک پہنچنے کے لئے مشعل راہ کا کام دے اور بدلتا ہوا نظام تعلیم معاشرہ اور وقت کے تقاضوں کو بھی بدرجہ اتم پورا کرے۔

تعلیم کے اغراض و مقاصد کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں یوں تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور ماہرانِ تعلیم نے اس میدان میں خوب خوب نامی جولانیا

دکھلائی ہیں جن سے بعض اوقات تعلیم کی غرض و غایت کے خطوط بجائے متعین اور واضح ہونے کے دھندلے نظر آنے لگتے ہیں۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ نئی نسلیں نہ صرف اپنے آباؤ اجداد اور زمانہ ماضی کے مفید علوم و فنون اور ادب و ثقافت کو حاصل کریں بلکہ خود ان کے عہد میں جو جدید ترقیات علوم و فنون، سائنس اور صنعت و حرفت میں ہوئی ہیں ان سے بھی پورا پورا استفادہ کریں۔

ایڈیٹیو آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی یہ کتاب "اسلامی نظام تعلیم" جس کا دوسرا ایڈیشن اب "مسلمانوں کا نظام تعلیم" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ مندرجہ بالا نظریات اور تقاضوں کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ملک کے تعلیمی حلقوں میں مقبولیت عام حاصل کر چکا ہے۔ تعلیمی درس گاہوں، بالخصوص اساتذہ کے تربیتی اداروں میں اس کی بہت مانگ ہوئی۔ ٹریننگ کالجوں کے طلباء نے بھی اس سے استفادہ کیا اور مبصرین تعلیم نے اس کے متعلق پر زور الفاظ میں اظہار پسندیدگی فرمایا۔ بالخصوص جب سے پاکستان میں "اسلامی تاریخ" کو اعلیٰ ثانوی تعلیم میں داخل نصاب کیا گیا ہے کتاب کی مانگ میں روز افزوں اضافہ ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے فاضل مؤلف جناب پروفیسر سعید احمد رفیق نے اس کی تدوین میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے، ہمارے مورخین نے برصغیر پاک و ہند کے دور وسطیٰ کے سیاسی کوائف کو تو پوزی تشریح و وضاحت کے ساتھ قلم بند کیا۔ لیکن تہذیب و تمدن میں جو پیش بہا ترقی ہوئی

اور خاص کر علوم کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں سلاطین و امراء نے اس عہد میں جو خدمات انجام دیں ان پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی۔ موجودہ عہد کے مورخین نے اس کمی کو محسوس کر کے قدیم ماخذوں اور دیگر ذرائع کی مدد سے حتی الامکان تلافی کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ابھی بہت کچھ کام کرنا باقی ہے کیونکہ اس عہد کے ثقافتی اور تمدنی حالات اگرچہ بہت کچھ روشنی میں اچھکے ہیں پھر بھی اسلامی نظام تعلیم، ترقی تعلیم اور ترتیب نصاب اور تعلیمی اداروں کے قیام و انتظام میں جو نصب العین پیش نظر تھا وہ ہنوز پر وہ خفا میں ہے۔ ہمارے لئے یہ ممکن تھا کہ اس کتاب کو طبع ثانی کے لئے ترتیب دیتے وقت اس میں مزید مضامین اور حواشی کا اضافہ کر کے اس کو مفید تر بنانے کی کوشش کرتے لیکن کانفرنس اکیڈمی کے سامنے اسی سلسلہ کا ایک بہت اہم اور تفصیلی منصوبہ (بزبان انگریزی) "ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن" کا ہے جس کی ترتیب و تکمیل کے کافی مراحل طے ہو چکے ہیں ابتدائے عہد تاریخ سے زمانہ حاضرہ کے تعلیمی مسائل پر پانچ پانچ سو صفحات کی چار جلدوں میں یہ ایک بسوٹ کتاب ہوگی جس میں اسلامی نظام تعلیم پر پوری تفصیل سے لکھا جائے گا۔ اور کوشش یہ ہے کہ اس مفید تعلیمی جائزہ کی تدوین میں کوئی پہلو تعلیم سے متعلق کسی نہج سے تشدد نہ رہے اس کتاب کی خاص ضرورت عرصہ دراز سے اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ بغیر سیر حاصل تاریخی پس منظر کے ہمارے ملک میں جب اور جو بھی تعلیمی اسکیم تیار ہوتی ہے وہ عمل درآمد کے وقت عام طور پر ناکام ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے ملک میں رہنے بسنے والوں کا ایک مخصوص کلچر قومی مزاج، روایات اور ترقی تعلیم

میں ان کی مسلسل جدوجہد اور قربانیوں کی اپنی جگہ ایک مستقل تاریخ ہے۔ جس کو نظر انداز کر کے نظام تعلیم کی تعمیر نو خاطر خواہ طریقہ پر بار آور نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ہر ایک تعلیمی منصوبہ میں اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھنا ناگزیر ہے کہ موجودہ سائنسی و حرفتی تقاضوں کا اس میں مکمل حل مل سکے اور ساتھ کے ساتھ نصابی تعلیم کے ذریعہ ہماری قوم کی حقیقی سیرت سازی بھی ہو سکے۔

دراصل تعلیم کوئی مقصود بالذات شے نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے۔ قومی نصب العین کے حصول کی کوشش کا اور اپنے قومی ثقافت و تمدن اور تہذیبی ذخیرہ کو محفوظ رکھنے کا۔ تعلیم سے قوموں میں شعور پیدا ہوتا ہے، یہ نہ صرف افراد کو ایسے شعبہ ہائے فنون سے آراستہ کرتا ہے جو دنیا میں ایک باعزت زندگی بسر کرنے اور معاشرہ کا ایک باعظمت اور قابل احترام فرد بننے کے قابل بنائے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی کے مقصد اور فرائض سے بھی واقف ہو کسی قوم کی ثقافتی انفرادیت، دماغی صلاحیت اور سیرت و کردار کی پختگی تعلیم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اس کے بغیر وہ اپنے ثقافتی تمدنی اور تہذیبی ورثہ کو، آئندہ نسلوں کے لئے صفحات تاریخ پر محفوظ کر سکتی ہے۔ جو قوم یہ سرمایہ بطور ایک امانت آئندہ نسلوں کی رشد و ہدایت اور ان کی راہنمائی کے لئے نہ چھوڑے وہ زندہ جاوید قوموں کی صف میں جگہ پانے کا استحقاق پیدا نہیں کر سکتی۔ تعلیم کو صرف دماغی بیداری، معلومات آفرینی اور سوسائٹی میں ایک خاص شخص اور بلند حیثیت حاصل کرنے کے ایک موثر ذریعہ کی حیثیت تک ہی محدود نہ رکھنا چاہیے بلکہ قومی نصب العین، معاشرتی و قومی ثقافت کی تخلیق، ترتیب و تکمیل

کا ذریعہ سمجھ کر اس کے اعلیٰ اصول اور مطامح نظر کے استدراک و استحصال کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ تعلیم قوم و معاشرہ کے کسی ایک محدود گوشہ پر ہی اثر انداز نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کے دائرہ اثر و عمل میں ترقی یافتہ قوموں کی تقابلی ہمہ جہتی عالمگیر سرگرمیاں بھی شامل ہونی چاہئیں۔ جن سے قوم کی فلاحی تعمیر مضبوط بنیادوں پر قائم ہو سکے۔

لہذا یہ کتاب جب آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ لائق مصنف نے متذکرہ بالامقاصد کی منادگی میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

آخر میں رفیق محترم جناب پروفیسر محمد حامی الدین خاں صاحب ایم، اے سابق صدر شعبہ تاریخ ہمارا جہ کالج جے پور کا مجھے شکر یہ ادا کرنا ہے جن کی نظر ثانی کے بعد اس کتاب کو زیور طبع سے از سر نو آراستہ کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ طبع اول کی طرح کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن پہلے سے زیادہ مقبولیت حاصل کرے گا۔



مخدوم جہانیاں جہاں گشت

تالیف: پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے

کراچی میں ایک نیا ادارہ تحقیق و تصنیف حال میں قائم ہوا ہے اس کے صدر جناب مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب، نائب صدر پروفیسر حافظ رشید احمد ارشد ایم اے، معتمد عمومی جناب محمد ایوب قادری ایم اے معاون معتمد مسٹر منور اسلام صدیقی۔ خازن جناب ثناء الحق صدیقی ایم، اے ہیں۔

ارکان میں پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم، اے۔ توکل حسین قدوائی صاحب، نصیب اختر صاحب، ثناء اللہ ندوی صاحب اور عبدالرشید شیخ شامل ہیں۔

ادارہ کا مقصد تاریخ اسلام، اکابر اسلام، بالخصوص اہل باطن و صوفیا اور مبلغین اسلام کے حالات زندگی پر لیسرچ کرنا اور ان کو کتابی شکل میں شائع کرنا ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی مسٹر محمد ایوب قادری کی تحریر کردہ کتاب "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" ہے جس میں حضرت موصوف کے مفصل حالات و سوانح بڑی کاوش و تحقیق سے جمع کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا تعارف جناب مولا محمد ناظم ندوی شیخ الجامعۃ العباسیہ بہاولپور۔ ویباچہ جناب ڈاکٹر سید معین الحق۔

پیش لفظ لفٹنٹ کرنل عطاء الرحیم اور مقدمہ جناب ثناء الحق صدیقی ہایم۔ اسے
 نے تحریر فرمایا ہے ثناء الحق صدیقی صاحب کے مقدمہ سے کتاب کی اہمیت اور افادت
 بڑی حسن و خوبی کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے۔ زبان و ترتیب کی رعنائی بھی حد درجہ
 لائق ستائش ہے، یہ کتاب ۲۲۲۱۸ ساٹز کے تین سو چار صفحات پر مشتمل ہے۔
 کاغذ، کتابت اور جلد دیدہ زیب ہے، آخر میں کتابیات اور اشاریہ اعلام نے
 کتاب کی اہمیت کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے۔ ہم ادارہ "تحقیق و تصنیف" کو اس
 قابل قدر پیش کش پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ اور متوقع ہیں کہ موجودہ عہد میں
 جبکہ ہر چہار جانب دین و اقدار دین سے بے اعتنائی اور اہل اللہ سے اظہار
 بیگانگی عام ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ادارہ جلد از جلد دوسرے نفوس قدسیہ کے حالات
 پر بھی اچھی اچھی کتابیں شائع کرے گا اور اس طرح صحیح اسلامی خطوط پر تعمیر ملی
 کی گراں قدر خدمات انجام دے گا۔ دما توفیقی اللہ باری



گلشنِ بے خار

تالیف: نواب مصطفیٰ خاں شیفہ

ترجمہ: احسان الحق فاروقی ایم، اے

غالب یہ فنِ گفتگو ناز و دیدیں ارزشش کہ او
نوشت درد لویاں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نگر

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے ادارہ تصنیف و تالیف راکیڈ ہی
آف ایجوکیشنل ریسرچ کی جانب سے جون ۱۹۵۶ء سے اس وقت تک گیارہ ہزار صفحات پر
شکل بکثرت بلند پایہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا برصغیر پاک و ہند کے تعلیمی و تحقیقی
حلقوں میں پرجوش خیر مقدم ہو چکا ہے۔ علمی خدمت گزاری کے اسی سلسلے کی
ایک نہایت اہم کڑی عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفہ
منظرِ جنگ کی مؤلف شاہکار کتاب "گلشنِ بے خار" کو جمع ترجمہ و حواشی ۲۰۳۰ ساڑھے
جلد ۵۵۲ صفحات پر عمدہ کاغذ و کتابت اور دیدہ زیب گروپوش کے ساتھ شائع
کیا گیا ہے۔ نواب مرحوم کے اخلاف نے جو عظیم احسانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
ایجوکیشنل کانفرنس اور مرستید گریس کالج پر کئے ہیں ان کی بناء پر کتاب کو جناب
غلام احمد صاحب مدنی سابق کمشنر کراچی کے نام نامی پر معنون کیا گیا ہے بارہ روپے

قیمت ہے۔

صاحب کتاب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم اپنی بے نظیر علمی قابلیت اور ادب نوازی کی بدولت برصغیر پاک و ہند کے علمی حلقوں میں قریباً ایک صدی سے مشہور و معروف رہے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آپ علمی استعداد اور باطنی خوبیوں کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں جن میں مومن، غالب، صدر الدین خاں آزرودہ، ذوق، مولانا فضل الحق خیر آبادی اور مولوی امام بخش صہبائی جیسے مشاہیر اجل شامل تھے، فرزند تھے بقول مرثیہ مرحوم آپ

”بنف شتاس و سخن داں ز نکتہ سنج و نکتہ داں۔ اخلاق

و خضائل میں مہبط انوار سعادت اور حاتم کرم اور سی

طرح علمی قابلیت میں بدر و ماہ تاباں، تقویٰ و طہارت

اور خدا پرستی میں زاہد شب زندہ دار تھے،“

ان کے والد بزرگوار نواب مرتضیٰ خاں بہادر عہد شہنشاہ فرخ سیر میں افغانستان سے وارد ہند ہوئے۔ غضنفر جنگ نواب محمد خاں ننگش والی فرخ آباد کے ہم جد تھے۔ مہاراجہ ہلکر، نواب امیر خاں والی ٹونک اور بعد ازاں لارڈ لیک کے ساتھ بڑے بڑے معرکے سرکے جس کے صلہ میں ان کو تین لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کی جاگیر عطا ہوئی اور علاقہ جہانگیر آباد انھوں نے اپنے خلیفہ الرشید نواب مصطفیٰ خاں کے نام خود خرید کیا۔

شیفتہ نہ صرف مسند آرائے علم و ادب تھے بلکہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ جس کی یاد اس میں سات سال

تک قید فرنگ کی تکالیف برداشت کیں اور ان کے وظائف سرکاری اور نصف حصہ جائیداد ضبط ہوا۔ نواب شیفۃ ۱۸۶۹ء تک بقید حیات رہے۔ سرسید کی تحریک سے آپ کو قریبی وابستگی تھی اور انہوں نے سرسید کو عالی جیسا انمول رتن دیا۔ نواب مصطفیٰ خاں حسرتی و شیفۃ تخلص کرتے تھے، انہوں نے تہذیب شعرا و ادب کی ایک نئی عمارت قائم کی جو نہ صرف فارسی کی ہم سطح ہو گئی۔ بلکہ بعض بالکمالوں کے ہاتھوں زیادہ بلندی پر پہنچ گئی۔ شیفۃ کی یہ خدمت ہماری ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، ان کا مجموعہ کلام اُردو اور تذکرہ "گلشن بے خار" وغیرہ ان کے ایجاد کردہ اسلوب نگارش کا بہترین ثبوت ہیں۔

"گلشن بے خار"، آج بھی شعرائے اُردو کے تذکرہ نگاروں کے لئے

ناگزیر سمجھی جاتی ہے اس کتاب نے سب سے پہلے ادب میں صحیح اصول تنقید و تبصرہ کی داغ بیل ڈالی۔ چونکہ موجودہ نظام درس و تدریس میں فن تنقید ایک ضروری جزو ہے اور اُردو ادب کو سمجھنے اور اس سے شغف پیدا کرنے کے لئے اس فن سے دل چسپی اور واقفیت نہایت ضروری ہے۔ اس لئے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے اس کتاب کا جو یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں داخل ہو چکی ہے اُردو ترجمہ شائع کیا تاکہ یہی خواہاں اُردو ادب کو اس سے استفادہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہو اور حقیقت اس کے ایک مستند با محاورہ اور کسالی اُردو زبان میں ترجمہ کی ضرورت ادبی حلقوں میں عرصہ دراز سے شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی۔

یہ حسن اتفاق ہے اور اُردو کے لئے فال نیک بھی کہ نواب صاحب

جیسے متجرب عالم۔ سخن سنج اور صاحب طرز انشاء پر دواز کی اس تخلیق فائقہ کو اردو جامہ پہنانے کا کام ایک ایسے قابل قدر دوست نے اپنے ہات میں لیا جو خود بھی فارسی اور اردو میں دستگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کے سحر سے مذاق سے متصف ہیں۔

مترجم کتاب ہذا جناب احسان الحق فاروقی ایم، اسے (منشی فاضل) سے ہیں کچھ عرصہ قبل متعارف ہوا اور پہلی ہی ملاقات میں آپ کی دل کش شخصیت سے کافی متاثر ہوا۔ فاروقی صاحب مشہور و معروف فقیہ سلطان التاکن حضرت صوفی حمید الدین ناگوری کی اولاد میں ہیں، آپ کی پیدائش ۱۹۱۵ء میں بھارت کے مشہور شہر جے پور کے علاقہ جھنجھنوں میں ہوئی۔ یہ مقام مذہبوں قائم خانی نوابوں کا دار الحکومت رہنے کی وجہ سے اسلامی معاشرت و تہذیب کا مرکز اور عالی مرتبت صوفیاء اور صاحب باطن بزرگوں کا مرکز رہا ہے۔ آج بھی وہ لوگ وہاں محو استراحت ہیں۔ اور ان کے مزارات و خانقاہیں مروج خلایق ہیں۔ فاروقی صاحب کم سنی ہی میں سایہ پداری سے محروم ہو گئے اس لئے انکی ابتدائی تعلیم ان کے جد امجد مولوی محمد رمضان صاحب کے زیر نگرانی ہوئی جو اپنے وقت کے جید عالم اور صاحب تصنیف تھے، لیکن وہ بھی آپ کو نو سال کا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد آپ اپنے چچا حضرت فخر الدین کے پاس جے پور تشریف لے آئے اور وہیں رہ کر..... آپ نے انگریزی اور اردو کی تعلیم حاصل کی جس سے فارغ ہونے کے بعد ریاست کے محکمہ زراعت میں ملازمت اختیار کر لی، لیکن تعلیم کا شوق برابر جاری رہا،

اور اردو فارسی کی اعلیٰ قابلیت کے امتحانات کی اسناد آپ نے زمانہ ملازمت ہی میں حاصل کیں۔

شہر جے پور ۱۸۵۷ء سے مسلمان شرفا اور اہل ہنر کا ایک اہم مرکزی مقام رہا ہے وہی لکھنؤ اور روہیلکھنڈ کے بہت سے باکمال مسند نشین علم و فضل اور صاحبانِ سیف و قلم نے راجستھان کی طرف توجہ کی ہے پور کے حکمرانوں کا چونکہ سلاطین مغلیہ سے قریبی تعلق رہا تھا اور ریاست کی بقا و ترقی ان کی بے مثل رواداری اور رعایا پروردگی کی مرہونِ منت تھی اس لئے دیگر راجپوت ریاستوں کے مقابلے میں جے پور نے وہی کی عظمتِ رفتہ کے ان جیتے جاگتے پیکروں کو زیادہ فراخ دلی سے ہاتھوں ہاتھ لیا، مہاراجگان اور روساء نے ان کی خاطر خواہ قدر افزائی کی، جاگیریں عطا کیں بیش قرار مشاہرے اور روزینے مقرر کئے یہاں تک کہ بہت سے مسلمانوں کو اپنے مشیروں اور مصاحبوں میں جگہ دی ان نووارد مسلمانوں نے بھی حق و فاداری ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ کوشش سے جہاں ایک طرف ریاست کی تشکیل نو اور اندرونی استحکام اور وقار کی بحالی کا مشکل کام بحسن و خوبی انجام پایا وہیں علوم و فنون کی ترقی اور صنعت و حرفت کی ترویج کے ساتھ ساتھ مشرقی اور اسلامی تمدن و ثقافت نے بھی فروغ پایا۔ کالج و اسکولوں کے جدید تعلیمیافتہ طلباء اور نوجوانوں میں بشمول ہندو مسلم، اردو شعر و ادب سے افسس پیدا کرنے میں جن لوگوں نے کام کیا ان میں مولوی محمد امیر الدین خاں اور پروفیسر حامی الدین خاں حال ڈپٹی ڈائریکٹر کانفرنس اکیڈمی کے ساتھ ساتھ فاروقی

صاحب نے بھی حصہ لیا۔ یوم نظیر، یوم اقبال اور لٹریچر کارپوریشن کے قیام میں ان صاحبوں نے بڑا حصہ لیا۔ شاعری میں فاروقی صاحب کو استاد سخن مولانا منظور احمد کو شرم حوم کا کوروی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

۱۹۴۷ء میں آپ پاکستان منتقل ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد محکمہ ترقیات بلدیہ کراچی (کے ڈی۔ اے) سے وابستہ ہو گئے اور اب تک اسی میں ہیں۔

فاروقی صاحب نے "گلشن بے خار" کا اردو ترجمہ کر کے علم و ادب کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ہمیں اس کتاب کو اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی مطبوعات میں شامل کر کے دلی مسرت ہے۔ ترجمہ شستہ، رواں اور... بانمناورہ ہے۔

فاروقی صاحب کی طرح دوسرے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی دوسری زبانوں بالخصوص فارسی کی پیش یہاں کتابوں کے ترجمے کر کے اردو کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کرنا چاہیے۔ ہماری قومی و عوامی زبان کو فارسی سے بہت کچھ لینا ہے علمی اصطلاحات کے وضع کرنے میں فارسی سے استفادہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ فارسی کی تحصیل کی طرف اب بہت کم توجہ دی جا رہی ہے اس لئے بھی یہ بسا ضروری ہے کہ فارسی کلاسیکی ادب کو اردو میں بہترین طریقے پر منتقل کیا جائے آخر میں ملک کے علمی ادبی اور تعلیمی اداروں نیز صاحبان علم و تحقیق کی توقع ہے کہ وہ ازراہ معارف پروری کتاب کی خاطر خواہ قدر دانی کر کے ہمیں ممنون و مفتخر فرمائیں گے۔

طالب لعل و گہر نیست و گرنہ خورشید
ہچناں در عمل معدن و کافست کہ بود

(حافظ)

علمائے سلف و نابینا علما

تصنیف: مولانا حبیب الرحمن خاں شرروانی (نواب صدر یار جنگ)

تعارف: علامہ سید سلیمان ندوی

تعلیقات و حواشی: مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی و ثناء الحق صدیقی ایم، اے

مولانا حسرت موہانی کا مشہور شعر ہے

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نشر

نظم حسرت میں کچھ مزانہ رہا

جس طرح حسرت کو ابوالکلام کی نثر دیکھنے کے بعد کسی کی نظم، حتیٰ کہ خود

اپنی نظم میں، جو مسلمہ طور پر بہت اونچی تھی کوئی مزاباقی نہ رہا۔ اسی طرح

میرے لئے اپنی زندگی میں حسرت شرروانی (نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن

خاں شرروانی) کو ۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۱ء پندرہ سال قریب سے دیکھنے اور بستے

کے بعد کسی دوسری عظیم شخصیت میں کوئی جاذبیت باقی نہ رہی۔ میرا کاروبار حیات

کچھ اس قسم کا ہے کہ عرف عام میں چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے لے کر بڑے

سے بڑے شخص سے میرا واسطہ رہا ہے مگر

دلم بہ ساغر و مینا نمی کشد حسرت
کہ ہمدہ نرگس مستانہ ز خود مارا

نواب صاحب جیسا ذمی علم اور ساتھ ہی عالی ظرف انسان دیکھنے میں نہ آیا۔ مرحوم کے انتقال کو سال پر سال بیت رہے ہیں اور اگرچہ ہر سانس میں ان کی یاد دل کو ستاتی ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کے شایانِ شان ان پر کچھ لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ سچ ہے انسانی فطرت کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے محسنوں سے ہی عملاً لاپرواہ رہتا ہے۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد ہی سے ارادہ تھا کہ ان کے لاتعداد احسانات کے حقیر بدل کے طور پر ان کی روح پاک کو خود ان کی پسند کا کوئی تحفہ پیش کیا جائے۔ سب سے زیادہ مرحوم کتاب کے عاشق تھے چنانچہ جون ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت گزاروں کے سلسلہ میں جب میں پہلی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ”سخن شناس نہ دلبرِ اخطا اینجا ست کی“ گرفت سے بچنے کے لئے میں نے طاہر وحید کا قلمی دیوان نذر گزارا، اور مجھے وہ مسرت و شادمانی آج تک یاد ہے جو اس ہدیہ محقر کو قبول کرتے وقت انکی چہرے سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہو رہی تھی۔ اسی طرح ان کے آخری ایام حیات میں جب ان کا جسم گھل کر تار عنکبوت ہو گیا تھا۔ ثقل سماعت اور نسیان انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ دنیا کے رنج و راحت سے بے نیاز ہمہ وقت صرف اپنے معبودِ حقیقی سے جاننے کی آرزو ان پر غالب تھی۔ میں نے ان کا مجموعہ فارسی کلام ”بوستانِ حسرتِ ثروانی“ خاص الخاص اہتمام سے طبع کرا کر خدمت گرامی میں پیش کیا تو لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور ہمہ تن محو ہو کر جب تک کتاب کا ایک ایک ورق الٹ پلٹ کر نہ دیکھ لیا دوسری جانب نگاہ غلط انداز تک نہ ڈالی۔ راقم

کے لکھے ہوئے مقدمہ کی پہلے ہی ”خوش گفتی و دُر سفتی“ کے مرتب و نڈتہب الفاظ میں داد دے چکے تھے۔

الغرض! غرض یہ کرنا تھا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کا حق ذرہ نوازی و معارف پروری ادا کرنے کی ایک ہی صورت سمجھ میں آئی کہ ان کی علمی یادگار کو اجاگر کیا جائے۔

نواب صاحب کی علمی یادگاروں میں ایک یادگار تو ان کا مشہور زمانہ کتاب خانہ جیب گنج ہے جو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کی جدید عظیم الشان عمارت میں منتقل ہو کر حیات جاوید پا گیا۔ اور دوسرے قریب ایک درجن بلند پایہ تصانیف ہیں، ان تصانیف میں جہاں تک راقم کی ناچیز رائے کا تعلق علماء سلف اور نابینا علماء، بہترین ہے۔ لہذا طے کیا گیا کہ اگرچہ اس کے بہت کافی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں تاہم اس کو از سر نو چھاپا جائے اور انتظام یہ کیا جائے کہ سلف صالحین میں سے جس عالم کے ذکر میں نواب صاحب نے دوسرے علماء و مشاہیر یا ممالک و بلاد کا ذکر کیا ہے ان پر توضیحات و تعلیقات کا اضافہ کر کے چراغ سے چراغ روشن کیا جائے۔ بلکہ پورا چراغوں کو دیا جائے۔

اس اہم کام کی بحسن و خوبی بجا آوری کے لئے ایک ایسے بزرگ کی تلاش کی گئی جو اہلیتِ کار کے اعتبار سے ہر طرح موزوں ہونے کے علاوہ نواب صاحب کی ذاتِ ستودہ صفات سے تعارف و واقفیت قریبی بھی رکھتا ہو، چنانچہ جناب مفتی محمد انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی کا انتخاب عمل میں آیا۔ مفتی صاحب سے نواب صاحب بھی بہت محبت کرتے تھے ایک مرتبہ راقم اور مفتی صاحب جیب گنج

چند روز قیام کرنے کے بعد رخصت ہونے لگے تو موصوف نے درج ذیل شعر ایک پرچہ پر لکھ کر ہم لوگوں کو مرحمت فرمایا ۵

کرم کردند الطاف و شہابی
زلطف نور شد روشن روانم

جناب مفتی صاحب نے بھی اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی فرمائش پر علمائے سلف کی توضیحات و تعلیقات قلمبند کرنے اور کتاب پر ۳ صفحات کا ایک بسوط و محققانہ مقدمہ لکھنے میں پورا پورا حق ارادت ادا کر دیا۔ ۵

اس اہم کام کی کامیاب انجام دہی میں جناب مفتی صاحب کے رفیق کار مسٹر ثناء الحق صدیقی ایم اے۔ بی ٹی لائق تحسین و ستائش ہیں کہ ان کی بالغ نظر اور امداد خاص کی بدولت کتاب کی افادیت میں چار چاند لگ گئے۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ قیمتی کتاب اپنے نئے روپ میں طبع ہو کر ملت اسلامیہ میں شغف علمی کی ایک تازہ روح پیدا کرنے کی موجب ہو اور بقول مصنف

علامہ ۵

رہ روان شوق از ما سالہا آر نہ زیاد
نقش با اینکخت در راہ محبت گام ما

حیاتِ حافظِ رحمتِ خاں

(دیباچہ طبع ثانی)

بازایں اوراقِ راشیرازہ کن

باز آئینِ محبتِ تازہ کن

”حیاتِ حافظِ رحمتِ خاں“ کی تالیف کا کام ۱۹۳۳ء میں ختم ہوا اور وہ اوائل ۱۹۳۳ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ علمی اور تحقیقی کتابوں کی ابتداء زمانہ کے ہاتھوں ناقدری ایک ضرب المثل بن گئی ہے۔ لیکن اس کتاب کا خلافتِ توقع پر جوش خیر مقدم ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ موقر اخبارات اور رسائل نے اعلیٰ درجہ کے تبصرے لکھے اور مشاہیرِ علم نے اس کی تعریف و توصیف میں بکثرت خطوط تحریر فرمائے ان مشاہیر میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق مولانا ظفر علی خاں، نواب سر محمد اکبر خاں (ہوتی - مردان) پرنس غازی الدین خاں (چترال) اور ڈاکٹر سید محمود صاحب کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

کتاب کیوں مقبول و مشہور ہوئی؟ یہ میرے لئے آج تک معتمد ہے۔

نے اسے مورخ، محقق اور ادیب بننے کے لئے نہیں لکھا۔ ایک عصری تقاضہ کو پورا کرنا البتہ میرے پیش نظر ضرور تھا۔ ۱۹۳۱-۳۲ء میں برصغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی شباب پر تھی جن میں ہند و برادران وطن اپنی غالب اکثریت دولت و ثروت اور دفتری بالا دستی کے باعث پیش پیش نظر آ رہے تھے۔ اور مسلم زعماء ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بلکہ اس سے بھی پہلے حضرت سید احمد شہید کے زمانے سے بے پناہ قربانیاں دینے کے باوجود کسی شمار و قطار میں نہ تھے۔ مسلم عوام بھی شدید کس پرسی اور احساس کمتری کا شکار تھے۔ مسلمانان ہند کے عظیم الشان تاریخی کارنامے اور مسلم جانبازوں کی بے مثل کارکردگیوں کو عالم فراموشی میں ڈال دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کے برعکس۔۔۔ رانا پرتاپ سنگھ شیواجی گرو گوبند اور بندہ پیراگی وغیرہم کو قوی ہیرو بنا کر خوب خوب اچھا لاچار ہاتھ ہاراکر کے علاقہ میں تو یہ حال تھا کہ شیواجی کی تصویریں گھر گھر اور دوکان دوکان آویزاں تھیں جنکو دیکھ کر ہر ہندو نوجوان اس جیسا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسلم قوم اور اس کے نوجوانوں کے سامنے ایسا کوئی مقامی ہیرو نہ تھا جس کی شخصیت اور کرداران میں جوش عمل پیدا کرنے میں معاون و مددگار ہو۔

شمالی ہند میں راقم کو اور جنوبی ہند میں مولوی محمود ننگوری کو اس صورت حال کا بیک وقت توار و خیال ہوا۔ میں نے حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی شخصیت کو مرکز توجہ بنایا اور محمود ننگوری نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ”سلطنت خدا داد میسور“ لکھ کر حیدر علی اور ٹیپو سلطان شہید کے مجاہدانہ کارناموں کو اجاگر کیا۔ دونوں کتابیں قریب قریب بیک وقت شائع ہوئیں

اور ان پر ایک ساتھ اخبارات و رسائل میں تبصرے شائع ہوئے۔
 روہیلوں اور ان کے جانباز سردار۔ حافظ رحمت خاں۔ نواب نجیب الدولہ
 اور نواب دوند سے خاں وغیرہ کا شمار مرہٹوں۔ جاٹوں اور سکھوں کے مانند
 غاصبوں اور سرکشوں کی صف میں تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ حیاتِ حافظ رحمت
 خاں کی اشاعت کے بعد سے یہ نظریہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ اور اٹھارویں صدی
 عیسوی کے تاریخی حالات لکھنے والا اب کوئی مورخ یا مضمون نگار ایسا نہیں
 ہے جو ان کو عزت و احترام کا درجہ نہ دیتا ہو۔ حیاتِ حافظ رحمت خاں کے حوالے
 اور اقتباسات بھی ہر جگہ دیئے جاتے ہیں۔

اس یادگار خدمت کے سلسلہ میں آغاز کار اس طرح ہوا کہ ۱۹۳۰ء
 میں علیگڑھ میں ایل ایل بی کے امتحان میں ناکام ہو کر جب میں اپنے وطن بریلی
 واپس آیا اور بوجوہ خانہ نشینی پر مجبور ہوا تو اسی زمانہ میں ایک روز حافظ الملک
 کے مقبرہ پر جانے کا مجھے خیال آیا۔ فاتحہ خوانی کے بعد کافی دیر میں وہاں بیٹھا رہا۔
 میرے دل و دماغ کے نہاں خانہ میں حافظ الملک کے عروج و زوال کے جو
 واقعات خوابیدہ تھے گنبد مزار اور گرد و پیش کے دوسرے شکستہ تاریخی آثار
 نیز ماحول کی ویرانی سے بیدار ہو گئے۔ پھر خود بخود دل میں تحریک پیدا ہوئی کہ اس
 مجاہد اعظم اور بطلِ حریت کے سچے حالاتِ زندگی سے دنیا کو روشناس کرنا چاہیے
 اور اس شہیدِ راہِ حق کی گرانمایہ شخصیت پر ڈیڑھ سو سال سے غلط فہمیوں کا جو پردہ
 پڑا ہوا ہے اس کو اب چاک ہونا چاہیے۔

اس وقت میرے سراپا پر ایک عجیب قسم کے خشوع و خضوع کی سی کیفیت

طاری تھی۔ گھروٹ کر آیا تو اسی روز سے میں انتہائی مجوش و انہماک کے ساتھ مطبوعہ اور قلمی کتب، نوشتہ جات، فرامین اور یادداشتوں وغیرہ کی فہرست ہی میں لگ گیا۔ اس زمانہ میں میرے مکان کے قریب ہی حافظ الملک کے اہل خانہ کا ایک پورا محلہ گلی نوابان نامی، موجود و معمور تھا جس میں ایسے بزرگوں کا اجتماع تھا جو قدیم روایات تہذیب و معاشرت اور نسبی خصوصیات کے حامل تھے۔ اسی طرح شہر کے مغرب و مشرق کے دوسرے محلوں میں اس عظیم المرتبت خواد کے کافی لوگ رونق دہ حیات تھے خصوصیت سے بزرگ صدیق خاں کے ستر سالہ بوڑھے نواب نثار احمد خاں سے جب میں ملا اور ان سے اپنے عزم و ارادے کا ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے انہوں نے اپنا یہ معمول بنالیا کہ روزانہ سہ پہر کو قریب دو میل پیدل چل کر میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے اور ایک دن میں جس قدر مواد فراہم ہوتا یا جتنا کچھ میں لکھ لیتا اس کو ملاحظہ فرماتے مقصد یہ تھا کہ میں کسی دن بھی کام کا تاغ نہ کروں۔ مجھے فکر رہتی کہ نواب صاحب جیسے بزرگ کافی زحمت اٹھا کر تشریف لاتے ہوں گے۔ مایوس واپس نہ جائیں۔ کچھ نہ کچھ کام انہیں دکھانے کے لئے ضرور کر لیا جائے۔

ایک دوسرے بزرگ مولوی محمد عظیم الشان خاں تھے جنکی بے لوث محبت کو کو میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا میری فارسی دانی محدود تھی اور فارسی کے قلمی مسودات اور کتابوں کی مقفی اور مسیح عبارتوں پر قابو پانا نہ صرف یہ کہ میرے لئے آسان کام نہ تھا بلکہ میں ان کی الجھنوں سے اکتا کر بار بار حیات حافظ رحمت خاں کی تالیف سے دست بردار ہونے کا ارادہ کر لیتا تھا لیکن

خاں صاحب موصوف نے میری ہمت بند ہائے رکھی، شام کے چار بجے سے پانچ چھ بجے تک میں روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ خالصتاً لوجہ اللہ تین سال تک مسلسل فارسی سے متعلق جو جو مشکلات ہوتی تھیں ان کو حل کرنے میں امداد فرمایا کرتے تھے۔

میری بیگم سیدہ انیس فاطمہ اور میرے والد محترم سید اسحاق علی صاحب مرحوم کا استقلال و ایثار بھی بے مثل تھا ان لوگوں نے اس علمی و قومی خدمت کے سلسلہ میں شب و روز کی مصروفیت کو نہ صرف خوشدلی کے ساتھ انگیز کیا بلکہ تین سال کے طویل عرصہ میں مجھ پر ایک دفعہ بھی تقاضہ نہ کیا کہ میں اسے ترک کر کے کچھ دُری روزگار کی بھی فکر کروں، درانحالیکہ میں صاحب اولاد تھا اور ہمارا خاندان ان دنوں سخت معاشی بحران میں مبتلا تھا۔



بالآخر وہ وقت آیا کہ قلم کا مسافر اپنا دشوار گزار سفر طے کر کے منزل مقصود پر پہنچا اور ایک روز شام کو قبل مغرب "تمت بالبحیر" ضبط تحریر میں لانے کی نوبت آگئی۔ اس وقت بجائے خوشی کے مجھ پر ایک دوسرا خوف و ہراس طاری ہوا کہ بار الہا! کتاب لکھنے کو تو لکھی گئی اس کے چھپنے کی کیا صورت ہوگی۔ میں نے اپنی میز کی دراد میں مسودہ کو بند کرتے ہوئے بڑی حسرت و یاس سے یہ خیال کیا کہ اب اس کو شاید ہی دوبارہ نکلنے کی نوبت آئے گی اور جس طرح ہزار ہا مصنفین اور مولفین کی مدت العمر کی کاوشیں قلمی کتابوں کی شکل میں ہندواری کی دوکان پر لسیا نسیا ہو جاتی ہیں اور نئی یا پرانی کتابوں کے ارزاں

فروش تاجروں کے ذریعہ امراء کے نجی یا پبلک کتاب خانوں کی زینت بنی پڑی رہتی ہیں تاکہ امتداد زمانہ سے کرم خوردہ ہو کر ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ میری کتاب بھی یہی انجام ہو، بہر حال تن بہ تقدیر کپڑے پہن کر اور سائیکل سنبھال کر بواخوری کے خیال سے باہر نکلا۔ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کرم فرما سید حضوری میاں جن سو برسوں سے ملاقات نہ ہوئی تھی مجھے زور زور سے آواز دے رہے ہیں میں رک گیا تو قریب آ کر انہوں نے فرمایا "ارے بھائی سید! کہاں جا رہے ہو؟" ہم نے سنا ہے کہ تم نے حافظ رحمت خاں کی بہت اچھی لائف لکھی ہے تو سنو! ان کے خاندان کے ایک فرزند صاحبزادہ عبدالواجد خاں ابھی حال میں ریاست بھوپال سے بریلی آئے ہیں۔ ان سے ذکر آیا تھا اور وہ آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں۔ آپ ابھی میرے ساتھ کتاب لے کر چلے۔ میں نے بہت کچھ عذر کیا کہ میرا جانا بے نتیجہ ہو گا کیونکہ میری ان سے کوئی سابقہ شناسائی نہیں ہے لیکن حضوری میاں جو دوست نوازی میں جنات کی سی خصوصیات رکھتے تھے زبردستی اپنے ہمراہ لے گئے۔ اور جناب صاحبزادہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ صاحبزادہ صاحب ایک شکیل و وجیہ اور خلیق آدمی ثابت ہوئے۔ انہوں نے مجھے عزت و تکریم کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسودہ کتاب مجھ سے لیکر اس کی ورق گردانی کی اور فرمایا کہ اس کو دو تین روز کے لئے میرے پاس چھوڑ دیجئے تاکہ ذرا تفصیل سے اس کا مطالعہ کر لوں میں نے گہرا کہہا کہ جناب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ کتاب میری جان ہے۔ اور میں اس کو کسی کے بھی

حوالے نہیں کر سکتا، اس پر وہ مسکرائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی خوابگاہ میں لینگے وہاں ایک بکس کھول کر فرمایا کہ اس میں کتاب کو رکھ دیجئے پرسوں اسی جگہ آپ کو محفوظ حالت میں ملے گی۔ ان کے کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میں بکس ہو گیا۔ اور بادل ناخواستہ کتاب چھوڑ کر واپس آ گیا۔ دو شب و روز ایسی بے چینی میں گزرے کہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ تیسرے روز میں بے تابانہ وقت مقررہ پر صاحبزادہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور بدحواسی سے عرض کیا کہ میری کتاب واپس کر دیجئے۔

اس دفعہ صاحبزادہ صاحب میری عجیب و غریب وحشت پر کھلکھلا کر ہنسے اور مثل سابق میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی خوابگاہ میں لے گئے اور اس بکس کو جس میں کتاب رکھی ہوئی تھی کھول کر فرمایا ”لیجئے! یہ رہی آپ کی کتاب“ میں نے بیتابانہ کتاب اٹھا کر اپنے قبضہ میں کی اور کہا: ”آپ کا بہت بہت، شکریہ! اب مجھے جانے کی اجازت دیجئے“ دراصل اپنے واسطے کی بنا پر میں اس وقت کتاب کی طباعت کے مسئلہ کو بالکل بھول چکا تھا۔ اور اس کو دوبارہ حاصل کرنے ہی کو اپنی بڑی خوش قسمتی سمجھ رہا تھا۔ صاحبزادہ صاحب بہت ہمدرد اور ماہر نفسیات انسان تھے۔ انہوں نے فرمایا ”میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مان رہا ہوں، مجھے ایک عرصہ سے خیال تھا کہ اپنے مورث اعلیٰ جافظ الملک حافظ رحمت خاں کی سوانح حیات خود لکھوں لیکن آپ نے ویسی ہی کتاب لکھ دی جیسی کہ میں چاہتا تھا۔ اب ہونا یہ چاہیے کہ آپ نے تو کتاب لکھ دی اور میں اس کو چھپوا دوں، کتاب بہت عمدہ طبع ہوئی

چاہیے“

مجھے اپنی قومی زندگی میں صاحب ثروت اصحاب کے قواعد کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اس لئے میں نے صاحبزادہ صاحب کی مہربانی کا شکر یہ تو ادا کر دیا لیکن مکان واپس آ کر پھر ان کی کافی عرصہ تک خبر نہ لی۔ ایک روز اتفاقاً بازار میں مڈ بھیر ہو گئی مجھے دیکھ کر فوراً تانگہ سے اتر آئے اور سلام و دعاء کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر کتب خانہ کے پارک میں لے گئے جہاں ایک بیچ پر بیٹھ کر زمانے لگے ”آپ تشریف نہیں لائے“، میں نے عرض کیا ”دوبارہ تو حاضر خدمت ہو چکا ہوں مزید حاضری کی توفیق نہ ہوئی“ اس پر موصوف نے خوش دلی سے فرمایا :-

”آپ جتنے اچھے مصنف ہیں اتنی ہی اچھی باتیں بھی کرتے ہیں۔ دیکھئے میں نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا ہے مجھ کو واقعی کتاب کو بہت شان دار طریقہ پر پھپھوانے کا جذبہ ہے۔ آپ بلا تاخیر اس کی طباعت کا تھیمہ بنوائے جس قدر روپیہ کی ضرورت ہو گی میں آپ کو پیش کروں گا“ اس دفعہ میرے دل پر صاحبزادہ صاحب کے خلوص کا گہرا اثر ہوا اور میں اسی روز بدایوں چلا گیا وہاں پہونچ کر مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی کو جسکی شفقت بزرگانہ کامیں عرصہ سے مورد تمنا ساری داستان سنائی اور انھوں نے اپنے صاحبزادہ مسٹر احمد الدین نیجر نظامی پریس سے نفیس کاغذ کتابت اور جلد بندی وغیرہ کا تھیمہ بنا کر میرے حوالہ کر دیا۔ جو اس سے سے میں نے ہزار روپیہ کا ہوا۔ اس زمانہ میں ایک ہزار کی قیمت اس وقت کے کم از کم

دس ہزار روپے کے برابر تھی۔ اس لئے مجھے تشویش ہوئی کہ اتنا بڑا تخمینہ مصارف صاحبزادہ صاحب کے لئے قابل قبول بھی ہو گا یا نہیں۔ بہر حال تین بہ تقدیر بریلی واپس آکر اسے موصوف کی خدمت میں پیش کیا، اور میری خوشی کی حد نہ رہی کہ صاحبزادہ صاحب نے اسکو نہ صرف بہ طیب خاطر منظور فرمایا بلکہ موعودہ رقم کا چیک بھی لکھ کر میرے حوالے کر دیا چیک لیکر میں سوچنے لگا کہ اس بد ذوق زمانے میں اگر کسی شخص کی خود اس کی اپنی سوانح عمری بھی لکھ دی جائے تو وہ اتنے روپے صرف نہ کرے گا کجا یہ کہ زمانہ ورنہ کے اس دنیا سے گزرے ہوئے اپنے مورث کی سوانح حیات کے لئے یہ خدا کا نیک بندہ اس قدر روپیہ دے رہا ہے۔ میرا وہم اس درجہ پر پہنچ چکا تھا کہ جب تک دوسرے روز چیک کی رقم بنک سے نقدی کی شکل میں ہاتھ میں نہ آگئی میں برابر اعتبار اور بے اعتباری کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ یادش بخیر! اپنی زندگی میں یہ پہلا ہی چیک بھی تھا جو کسی نے مجھے دیا تھا اور اس کی بدولت میں نے کسی بنک کے اندر قدم رکھا تھا۔



پہلا مرحلہ اچھی کتابت کا تھا سو اس کے لئے اس زمانہ میں منشی فیض الحسن المخاطب «بد رقم» کا اضلاع بریلی و روہیلکھنڈ میں بہت شہرہ تھا۔ انکی نازک و ماعنی اور طبیعت کے کھرے پن کی بھی بہت سی کہانیاں مشہور تھیں تاہم میں بہت کر کے منشی صاحب کے مکان واقع محلہ خواجہ قطب بریلی پہنچا۔ کنڈی لکھنؤ کی تو ایک چھوٹا اور سیاہ فام شخص نمودار ہوا اور اس نے میرے سلام

کی پرواہ کئے بغیر بڑی تلخی سے پوچھا ”کہئے کیا ہے“؟ میں نے کہا آپ سے کتاب لکھوائی ہے۔ بولے ”مجھے فرصت نہیں“ میں نے کہا بہتر ہے کم از کم پانی تو پلا دیجئے اور ممکن ہو تو تباکو کا ایک پان بھی کھلا دیجئے۔ چک کر بولے ”خوب! بہت خوب!“ زور سے کنواڑ بند کر کے مکان کے اندر گئے اور تھوڑی دیر میں ایک کٹورے میں پانی اور بنا ہوا پان کا ٹکڑا ہاتھ میں لیکر واپس آئے ہیں اس دوران میں ان کے دروازے کی دہلیز پر بڑے اطمینان سے بیٹھ چکا تھا۔ پانی پیا۔ پان کھایا۔ پھر اس کے بعد بادل ناخواستہ رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہوا تو اس وقفہ میں وہ مجھے اور کتاب کے مسودہ کو جو میری بغل میں دبا ہوا تھا برابر غور سے دیکھتے رہے اور جب انھوں نے خیال کیا کہ میں مایوس جانے والا ہوں تو لٹکار کر کہنے لگے ”کیا کتاب لکھی ہے آپ نے“؟ میں نے مسودہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ کھڑے کھڑے تھوڑی سی اس کی ورق گردانی کی اور کہیں کہیں سے اُسے کچھ پڑھا بھی۔ اس کے بعد فرمایا۔ ”کتاب تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دیکھیے صاحب! اگر آپ مجھ سے کتاب لکھوائیں گے تو $\frac{20 \times 26}{8}$ ساڑھے کے سولہ صفحات دینے ایک جزو کے چار روپیہ پچاس پیسہ لوں گا“ اپنی دانست میں انہوں نے مروجہ نرخ سے اس قدر بڑھا کر اجرت کے دام بتائے کہ گویا میں انکار کر کے ان کی جان چھوڑ دوں گا۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ جناب میں آپ کو چار روپیہ پچاس پیسے کے بجائے پانچ روپیہ جزو دوں گا لیکن بشرط یہ ہوگی کہ جب تک میری کتاب ختم نہ ہو جائے آپ دوسرا کام نہ کریں گے۔ منشی صاحب کو میرے جواب پر تعجب سا ہوا اور پہلی بار کھلکھلا کر ہنسے اور بولے ”میں بڑے شکر مند ہوں“

معلوم ہوتے ہو۔ اچھی بات ہے جو کام میرے ہاتھ میں ہے اٹھو روز میں ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ کی کتاب لکھنا شروع کروں گا لیکن ایک بات سن رکھئے کہ کاپی کی صحت کرنے آپ خود میرے پاس آیا کریں گے اور بعد صحت ہر جزو کی اجرت جب آپ مجھے دیدیں گے تو اس کے بعد آگے لکھا کروں گا، میں نے منشی صاحب کی یہ شرطیں بھی مان لیں بلکہ ایک جزو کے پیشگی پانچ روپیہ بھی نذر کر دئے۔

ان منشی فیض الحسن ”بدرقم“ نے جیسی کتاب لکھی اس کی آج تک ہوم ہے بلکہ آفسٹ پرنٹنگ کے ماہرین بھی اسکو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ اور اب جبکہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن نذرناظرین کیا جا رہا ہے تو پانچ روپیہ کے بجائے بتیس روپے فی جزو کتابت کے دئے گئے ہیں اور اسی مناسبت سے دوسری مدات طباعت پر صرف کثیر ہونے کے باوجود کتاب جیسی کچھ چھپی ہے آپ کے سامنے ہے سچ ہے ط

گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

کتاب کے پہلے ایڈیشن میں دس روپیہ ریم کا چکنا و لاتی کا غزل لکھا گیا تھا جو آج کل ستر، اسی روپے ریم کے حساب سے بمشکل دستیاب ہوتا ہے نظامی پریس بدایوں نے بھی طباعت میں کمال کر دیا اور خود مسٹر احید الدین کا کہنا ہے کہ ایسی اچھی کتاب ان کے ہاں سے چھپ کر نہیں نکلی اور اس سے ان کے مطبع کی نیک نامی میں خاصہ اضافہ ہوا، پروف ریڈنگ کا کام مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی مرحوم و مغفور جیسے جتید صحافی اور مستنف

نے بہ نفس نفیس فرمایا جس کی وجہ سے کتاب میں ہر قسم کی غلطیوں کا امکان ختم ہو گیا۔ متذکرہ بلا طباعت کی تمام خوبیوں اور چار سو صفحات کی ضخامت کے باوصف کتاب کی قیمت تین روپیہ سے زیادہ نہ رکھی جاسکی جس پر کتب فروشی کو تینتیس فیصدی کمیشن دیا گیا۔ اس کے برعکس جب کتاب کا اسٹاک ختم ہو گیا اور اس کو دوبارہ چھپوانے کی گونا گوں عسلاطی زندگی نے مجھے فرصت نہ دی تو فروخت شدہ کتابیں مشاہیر کو نذر کرنے کے لئے خود میں نے پہلے پانچ روپے پھر دس روپے اور بعد پچیس روپے فی جلد کے حساب سے خریدیں۔



جس طرح کتاب کی اشاعت پذیری اور اس کی مقبولیت میں قدم قدم پر تائید ایزدی کار فرما رہی اسی طرح خود مجھ کو اور جناب صاحبزادہ عبدالواجد خاں صاحب کو اللہ رب العزت نے اپنے بے پایاں انعامات سے نوازا۔ صاحبزادہ موصوف معاشیات میں ایم اے کر کے ہزاری انس نواب سر حمید اللہ خاں بہادر فالی ریاست بھوپال و چائسلر چیئر آف پرنسپلز کے سکریٹری تھے، اس عہدہ سے سبکدوشی حاصل کر کے وطن واپس آئے تھے تو اس وقت ہی ان سے میری وہ ملاقات ہوئی جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اس زمانہ میں ان کے سامنے کوئی مستقبل نہیں تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد گھر بیٹھے ان کے پاس مہاراجہ پٹیالہ کی پیشکش آئی اور آپ کی حکومت کے سکریٹری اور انڈیری کیپٹن بنائے گئے۔ مہاراجہ نے کارگزاری سے متاثر

ہو کر دو سال کے لئے آپ کو ولایت پی ایچ ڈی اور بریٹری کے امتحانات پاس کرنے کے لئے بھیج دیا۔ ولایت سے واپس آئے تو چیبر آف پرنسپلز کے سکریٹری مقرر ہوئے پھر کچھ عرصہ بعد آپ ریاست جاوہر کے وزیر اعظم کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہو گئے بعد ازاں متحدہ بنگال کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولس ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد سکریٹری آف اکنامک رلیفیرس کے ڈپٹی سکریٹری مقرر ہوئے اور اب نیک نامی کے ساتھ وظیفہ یاب ہو کر اپنے اوقات عزیز اطمینان و سکون کے ساتھ کراچی میں گزار رہے ہیں۔

راقم کا معاملہ یہ رہا کہ ملک میں ایک کامیاب مصنف خیال کئے جانے کے علاوہ ۱۹۳۵ء سے تا ایں دم مسلمانان پاک و ہند کی تعلیمی و علمی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینے کے مواقع بھی مجھے اس کتاب کے طفیل حاصل ہوئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے ۱۹۳۳ء میں حیاتِ حافظ رحمت خاں چھپنے کے بعد فیض عام ہائی اسکول میرٹھ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس سر شیخ عبدالقادر صاحب مرحوم کی صدارت میں تھا جس میں بھی شریک ہوا۔ ایک ریزولوشن پر تقریر کرنے کے لئے جب صدارت کی جانب سے میرے نام کا اعلان ہوا اور میں ڈانس پر گیا تو "صدر محترم و حضرات" کے الفاظ زبان سے ادا کرنے ہی پایا تھا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سکریٹری کانفرنس اپنی نشست سے اٹھ کر بولے کہ "ٹھہریئے صاحب" میں نے اپنی تقریر روک دی اور پریشان ہوا کہ نہ معلوم کیا غلطی سرزد ہوئی ہے جو نواب صاحب مجھے تقریر کرنے سے

روک رہے ہیں۔ عین اسی وقت نواب صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجمع کو مخاطب کیا اور فرمایا کہ صاحبو! ان بریلوی نے ایک لاجواب کتاب لکھی ہے اسے میں تین بار پڑھ چکا ہوں ہنوز سیری نہیں ہوئی ہے۔ کتاب اپنے ساتھ لایا ہوں۔ اس کے بعد نواب صاحب ڈانس ہی پر مجھ سے بغلیں ہوئے اور میری پیشانی کو بوسہ دے کر فرمایا "اب تقریر کرو" اس ڈرامائی عزت افزائی سے میرا دل اس قدر بڑھا کہ اس کی لذت آج تک فراموش نہ ہو سکی۔ حاضرین جلسہ نے بھی مسرت سے تالیابجائیں۔ حضرت نواب صدریاری جنگ بہادر کی فطرت گیمیا اثر نے ہی مجھے یکم جون ۱۹۳۵ء سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مددگار کے عہدے پر پہنچایا اس جگہ پر مجھ سے پہلے خان صاحب میر ولایت حسین۔ مولوی محمود احمد عباسی۔ قاضی تسلیم حسین ایم اے مولانا عبدالمجاہد وریا بادی اور خان بہادر مولوی اور لیس احمد جیسے ذی علم اصحاب کام کر چکے تھے اور اس کو دارالعلوم علیگڑھ و بیرون علیگڑھ میں کافی اعزاز کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ اس آسامی کے لئے ۱۵۵۰ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار اصحاب نے درخواستیں دی تھیں جن میں بہ اعتبار تعلیمی اسناد میری درخواست سب سے کمزور رہی تھی۔ لیکن جب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کا مسئلہ پیش ہوا تو نواب صاحب نے میری تصنیف کا ذکر کر کے فرمایا کہ "ہمیں کام کا آدمی مل گیا ہے۔ اس لئے دوسری درخواستیں دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے" اس مرحلہ پر مغفور کی مولانا سید طفیل احمد منگلوری مرحوم اور استاذی پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب نے پر زور تائید کی اور وہ دن اور آج کا دن ہے کہ میں مالی نقطہ نظر

سے تو نہیں البتہ علمی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے اعتبار سے خاصا کامیاب اور ترقی الحال ہوں۔

میرے لئے یہ خوش نصیبی بھی کچھ کم نہیں ہے کہ بہت سے انقلابات اور حوادث ذاتی و زمانی سے گزرنے کے باوجود خدائے بزرگ و برتر نے تیس سال کے بعد مجھے پھر فرصت ارزانی فرمائی کہ ”حیاتِ حافظ رحمت خاں“ ہمیری اپنی نگرائی میں از سر نو چھپ رہی ہے۔ نہ صرف مثل سابق اردو میں بلکہ انگریزی میں بھی۔

انگریزی ترجمہ کی تحریک اس طرح ہوئی کہ ۱۹۴۷ء میں بمقام حیدرآباد دکن انڈین ہسٹری کانگریس کے پانچویں اجلاس میں ”نواب دوند سے خاں“ پر جب میں نے اپنا تحقیقی مقالہ پڑھا تو میرے سیکشن کے چیئرمین خان بہادر پروفیسر کمیسر پی ایم ایس ای، ایس دیٹا ٹرٹو، بیٹی نے مجھے دریافت کیا کہ ”کیا آپ ہی نے حیاتِ حافظ رحمت خاں لکھی ہے؟“ میں نے عرض کیا کہ ”جی ہاں“ اس پر فرمایا کہ ہم ایسی ہی کتابوں پر ڈاکٹر پیٹ دیتے ہیں، آپ اس کا انگریزی میں ترجمہ کیوں نہیں کرتے تاکہ اردو سے نابلد اسکالر بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ جس اتفاق سے اس وقت میرے فاضل دوست پروفیسر محمد حامی الدین خاں صدر شعبہ تاریخ ہمارا جامعہ کالج جے پور بھی جلسہ میں تشریف رکھتے تھے آپ نے میرے بجائے پروفیسر کمیسر پیٹ سے وعدہ کیا کہ وہ حیاتِ حافظ رحمت خاں کا انگریزی ترجمہ کر دیں گے۔ بات رفت گزشت ہو گئی۔ اسی سال بیت گئے تا آنکہ پروفیسر حامی الدین خاں جے پور سے کراچی آکر ہمارے

آل پاکستان ایجوکیشنل کی اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹیچنگ میں بطور مقرر ہوئے اور آپ نے بھوائے گل اور مڑھوین باوقا تھا نہایت تندہی سے اپنے پرانے وعدہ کا ایفا فرمادیا۔

ایک کوتاہی کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ شدید عیدیم الم فرصتی اور سائیکس پیکو کے ساتھ خرابی صحت کے باعث تازہ تاریخی تحقیقات کی روشنی میں حیات حافظ رحمت خاں میں مزید اضافے نہ ہو سکے اور کتاب کو قریب قریب جوں کا توں چھاپا گیا ہے۔ حتیٰ کہ خاندانی شجروں کو بھی مطابق حال نہ کیا جاسکا۔ البتہ میرے صاحب نظر رفقاء نے کارپرو فیسر محمد حامی الدین خاں مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، مسٹر محمد ایوب قادری ایم اے اور برخوار سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی نے چھپنے سے پہلے اس کتاب کی جس قدر دیکھ بھال ممکن تھی کر لی ہے۔ علاوہ بریں مجھے اب یہ بھی اطمینان ہے کہ ملک میں حصول آزادی کی بنا پر اٹھارویں اور انیسویں صدی کی صحیح تاریخ پر موجودہ زمانے میں کافی کام ہو رہا ہے اور روہیلوں اور اس کے سرکار حافظ الملک حافظ رحمت خاں وغیرہ کو اپنے اصلی خدو خال میں پیش کرنے کی لائق ستائش کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس خصوص میں فاضل دوست ڈاکٹر سید معین الحق جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی اور ان کے لائق شرکائے کار کی مساعی کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔

آخر میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کی اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے جملہ ارباب عمل و عقد اور وزارت تعلیم حکومت پاکستان کا بھی مجھ

پر شکر واجب ہے جن کی معارف پروری کی بدولت حیاتِ حافظِ رحمتِ خاں کی
 اُردو اور انگریزی ہر روزبانوں میں اشاعت پر معتد بہ رقم صرف کی جاسکی
 ورنہ خود اپنا حال تو ہمیشہ کی طرح عجمہ ندامت و امن از کجا آرم، کام مصداق
 ہے۔

نالہٴ صورتے بگرفت بلبیل ساختند
 لختہائے دل بہ کیجا جمع شدہ گل ساختند



”عظیم علمائے نفسیات“

تصنیف : ایس۔ اسٹینفیلڈ سارجنٹ

ترجمہ و تعلیقات : پروفیسر عبد المجید قریشی

جناب پروفیسر عبد المجید قریشی سابق صدر شعبہ ریاضیات علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی کی تیسری ضخیم کتاب ”عظیم علمائے نفسیات“

*The Basic Teachings of the Great
Psychologists by S. Stansfield
Sargent Ph.D.*

کا اردو ترجمہ ابھی حال میں ہماری اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان
ایجوکیشنل کانفرنس کے اہتمام سے بائٹراک مکتبہ فرنیکلن لاہور نیویارک شائع ہوا

ہے اور اسی تقریب میں ہم اس وقت ’العلم‘ کے سرورق پر محترم قریشی صاحب کی
تصویر شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اس وقت موصوف کی

عمر ۷۶ سال ہے اور یہ تصویر ۶ سال پہلے کی ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ہر وہ شخص جس کا گذشتہ پچاس سال کے عرصے میں علیگڑھ سے کچھ بھی واسطہ رہا ہے وہ قریشی صاحب کی گرامیہ اور قابل احترام شخصیت سے بخوبی واقف ہے اور برصغیر پاک و ہند کے علمی و تعلیمی حلقوں میں ان کے عقیدتمندوں کا حلقہ جس قدر وسیع ہے شاید ہی کسی دوسرے شخص کا ہو۔ مشاہیر علیگڑھ کے سرخیل کی حیثیت سے ۱۹۲۷ء تک قریشی صاحب مسلم یونیورسٹی میں رہے۔ اس کے بعد سے اپنے قدیم وطن سرگودھا میں عالمانہ وقار اور میٹل خودداری کے ساتھ یاد خدا اور خدمت علمی میں خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ سے فیض یافتہ لوگوں میں صدر مملکت پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں جیسے عظیم المرتبت رہنمائے ملت اور راقم الحروف جیسے ناچیز خادوم علم و فن تک شامل ہیں۔ موضوع حد درجہ متوکلانہ طریقہ پر ایام گزاری کر کے کلاسیکی اہمیت رکھنے والی خالص فنی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی اہم خدمت میں اپنے اوقات عزیز صرف فرما رہے ہیں، ہماری اکیڈمی کی جانب سے آپ کی سب سے پہلی کتاب "مقدار انسانی" ۱۹۵۹ء میں طبع ہوئی یہ کتاب مشہور زمانہ فرانسیسی سائنسدان اور مفکر لی۔ کامت۔ دونوائے کی ہیومن ڈسٹنی (Human Destiny) کا اردو ترجمہ ہے جس میں مصنف نے کائنات میں انسان کا صحیح مقام اور اسے زمین پر اس کے وجود کا مقصد متعین کرنے کے لئے بکثرت ادوی و روحانی

۱۹۷ مقبول آباد۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں فاقی کوٹھی بنا کر قریشی صاحب کراچی منتقل ہو گئے ہیں اور موصوف نے ابھی حال میں انہی سال تقریباً سا لگرہ منائی ہے۔

(بریلوی)

لائچل مسائل کو سائنٹیفک طریقہ استدلال کے ذریعہ سلجھانے کی کوشش کی ہے
 ۱۹۶۰ء میں ہماری شائع کردہ (بہ اشتراک مکتبہ فرنیکن) قریشی صاحب
 کی دوسری کتاب ”چند عظیم علمائے جراثیم“ ہے جو ڈاکٹر پال . ڈی . کرائف کی
 کتاب بائکروب ہنٹرس (Microbe Hunters) کا ترجمہ ہے اس میں
 گیارہ ممتاز علمائے جراثیم کا تذکرہ ہے جنہوں نے جرثومہ جوئی کے فن اور سائنس
 کو جنم دیا ہے۔ ان کے حالات پڑھنے سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ سائنس میں نئی
 دریافتیں کرنے کے لئے اعلیٰ سندوں، بڑی بڑی تجربہ نگاہوں اور سرمایہ کی اتنی
 ضرورت نہیں جتنی کہ مسلسل انہماک عزم راسخ۔ استقامت اور محنت شاقہ
 کی ہے۔

متذکرہ بالا دونوں کتابوں کی ضخامت علی الترتیب پانچ سو اٹھتر اور
 پانچ سو انتالیس یعنی کل ایک ہزار ایک سو ستتر صفحات ہے اور ان کے ذریعہ
 اردو کے سرمایہ علمی میں نہایت گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔



تیسری زیر عنوان کتاب ”علمائے نفسیات“، (جو قریب چھ سو صفحات پر
 مشتمل ہے) کے مطالعہ سے واضح ہو گا کہ جناب قریشی صاحب نے ایک اوق
 فنی کتاب کا کس قدر محنت اور عرق ریزی سے آسان اور عام فہم اردو میں
 ترجمہ کیا ہے۔ عبارت کا تسلسل اور روانی جاہ جا ادب کی چاشنی اور سبب
 سے زیادہ سائنسی مصطلحات کے نہایت سادہ اور آسان مترادفات، نیز اس
 کتاب پر آپ کا ایک مختصر لیکن عالمانہ مقدمہ ایک ایسا شاہکار ہے جس کی

مثال ابھی اردو میں بہت کم ملتی ہے۔

نفسیات کا مطالعہ نہ صرف افراد کی روزمرہ زندگی کو منظم کرنے اور سنوارنے کے لئے بیکہ ضروری ہے بلکہ اجتماعی زندگی اور قوموں کے عروج و نصب میں بھی اس کی کارفرمائیاں عجز العقول ہیں اس علم کا دیگر مفید علوم مثلاً اخلاقیات اور عمرانیات وغیرہ سے گہرا تعلق ہے، یہ صحیح ہے کہ دیگر سائنسی اور اور ما بعد الطبیعیاتی علوم کی طرح نفسیاتی عوامل مسلمات اور اٹل قوانین کا درجہ حاصل نہیں کر سکے ہیں لیکن ان کی صداقت و حقانیت اور نتائج کی صحت محل نظر نہیں ہو سکتی۔ ان پر کار بند ہو کر ہم معاشرے کو پراگندگی اور عدم انضباط سے بچا سکتے ہیں۔

ایک نئی قوم کو جس کے ہات میں حریت و جمہوریت کی باگ ابھی آئی ہے اس کے مطالعہ کی سخت ضرورت ہے۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ علم النفس جس کو دوبارہ زندہ کر کے اس میں ایک نئی روح پھونکنے اور یورپ تک پہنچانے میں مسلمانوں نے قابل قدر اور لافانی خدمات انجام دی ہیں ان کے چھوڑے ہوئے سرمایہ علمی سے اردو کا دامن بالکل خالی نہیں ہے۔ یہ صورت حال بھی اُمید افزا ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں یہ مفید مضمون روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے، البتہ یہ بات قابل افسوس ہے کہ اردو میں نفسیات پر اعلیٰ معیاری کتابیں ابھی تک نہیں لکھی گئی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ کہ آریاب علم و دانش جن کے قبضہ قدرت میں ہماری قوم کی نئی نسلوں کی ماغی و تہذیبی نشوونما ہے ابھی تک اسی قسم کے فنی مضامین اعلیٰ جماعتوں میں اردو

میں پڑھانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے اور اپنے طرز عمل کے جواز میں اُردو کی مفروضہ عدم وسعت اور کم ہانگی کا عندر پیش کرتے رہتے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی نے البتہ ابھی حال میں اُردو کو آئندہ ذریعہ تعلیم قرار دے کر نہایت مستحسن اقدام کیا ہے جس کے لئے وہ تمام طالبان علم و فن کے شکریہ کی مستحق ہے۔ پاکستان کا معاشرہ نیز افراد اس وقت اجتماعی و انفرادی زندگی کے موڑ پر کھڑے ہیں سب سے اہم مسئلہ جو جمہوری حکومت کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے وہ صحیح قائدین یا رہنماؤں کا انتخاب ہے۔ کیونکہ ملک کی سالمیت اور بقا کا انحصار اُس کے رہنماؤں کی شخصیت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ قائدین کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لینا اور یہ انداز لگانا کہ وہ ہماری اطاعت پذیری اور اتباع کو محض اپنی مقصد براری کا آلہ کار نہیں بنائیں گے۔ یہ صلاحیت اور قابلیت افراد میں علم النفس کے اصولوں کو سمجھنے اور ان پر کار بند ہونے ہی سے فروغ پاسکتی ہے، اس طرح اور بہت سے مفید اور ترقی پذیر امور اور منصوبے ہیں جن کی کامیابی کا دار و مدار اس علم کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے سے ہے۔

اس کتاب میں ایسے تمام مفید موضوعات اور مسائل سے عالمانہ اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور قریشی صاحب نے ان مشکل مسائل کو اسی اُردو میں ترجمہ کر کے اور دقیق اور مشکل محاورات و الفاظ سے بچکر اُردو طبقہ پر بڑا احسان کیا ہے۔ جناب مولوی حامد علی خاں صاحب ڈائریکٹر مکتبہ فرنیکلن لاہور بھی دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کے اشتراک و اتفاق

عمل سے یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو سکی۔ اُمید ہے کہ ناظرین
کتاب کے مغز و معرفت سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔



راہی اور راہ نما

تصنیف: سید الطاف علی بریلوی
(پیش لفظ)

موجودہ عوامی اور جمہوری دور میں افراد کی اہمیت روز بڑھ رہی ہے۔ سماجی عمل ارتقائے ہر انسان کو وہی اہمیت دے دی ہے جو کسی زمانہ میں بڑے بڑے شہنشاہوں، جنگجوؤں، مدبروں اور فلاسفوں وغیرہ کو حاصل تھی۔ ایک وقت تھا کہ صرف عظیم المرتبت اور گرانمایہ شخصیتوں کا ہی یہ حق سمجھا جاتا تھا کہ انکی یادگاریں قائم کی جائیں۔ ان کے افکار و اقوال کو جمع کیا جائے اور ان کی سوانح عمریاں ضبط تحریر میں لائی جائیں۔ ایک عام آدمی میں کوئی ایسی بات خیال نہیں کی جاتی تھی کہ اسے کسی اعتبار سے قابل اعتنا تصور کیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ ساری دنیا میں بڑے بڑے مقبرے اور دوسری یادگار عمارتیں نیز خودنوشت یاد دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں زیادہ تر نامور لوگوں کی پائی جاتی ہیں اور اس کے مقابلہ میں کروڑوں افراد گناہی کی گہری تاریکیوں میں مستور ہیں۔

دنیا میں غالب اکثریت عوام کی ہے جن کے مسائل حیات بڑے لوگوں سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ذمی مرتبہ اصحاب کے حالات کس

کام کے؟ زیادہ سے زیادہ وہ ابطلانِ عجائب پرستی اور ذہنی آسودگی کا سانچہ
 بہم پہنچائیں! تو پہنچائیں! زندگی کی ان مشکلات سے جو غریبوں اور مجبور و
 لاچار لوگوں کو پیش آتی ہیں، باختیار، فارغ البال اور خوش نصیب اصحاب
 کو کیا واسطہ؟ لہذا آخر الذکر طبقہ کے کوائف و حالات اول الذکر کے لئے نہ
 کارآمد ہو سکتے ہیں اور نہ قابل تقلید!

مکان لباس اشیائے خورد و نوش کی فراہمی اور اولاد، متعلقین کی تعلیم
 و تربیت نیز شادی بیاہ کے فرائض سے سبکدوشی جہاں ایک جماعت کے لئے
 معمولی اور آسان کام ہیں وہاں دوسرے انسانوں کے لئے انتہائی سخت
 اور جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ پوری پوری زندگی کی صبر آزمائی یا صحتوں کے
 بعد چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور وہ بھی اکثر
 حالتوں میں نہیں ہو پاتیں۔ اور انجام کار یوں ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر حیات
 مستعار ختم ہو جاتی ہے۔

ایسے حالات میں مناسب یہ ہے کہ اقلیت کے بجائے زیادہ تر اکثریت
 کے مصائب و آلام اور روزمرہ پیش آنے والے مسائل زندگی کے عین مطابق
 واقعات۔ سیدھے سادھے انداز میں فلم بند ہوں اور دکھایا جائے کہ
 ایک غریب و متوسط الحال انسان کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ کس درجہ فطری
 قوت مدافعت اس کا ساتھ دیتی ہے؟ اور کس کس منزل پر امر کافی جدوجہد
 کے باوصف و دنیا کامی و نامرادی کا منہ دیکھتا ہے؟

ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ناسازگار اور ناموافق حالات کے ہونے

ہوئے ہمت و استقلال۔ دیانتداری، وضع داری، وفا شعاری اور خدا ترسی کو ہات سے نہیں جانے دیتا۔ چنانچہ اسی احساس کے تحت فی زمانہ شخصیت نگاری اور خاکہ نویسی کے لئے کرداروں کے انتخاب میں کسان، مزدور، غریب، طالب علم، آرٹسٹ، فاقہ مست شاعر، مفلوک الحال مصنف اور اخبار نویس، ادنیٰ تاجر، کثیر العیال کلرک اور اسکول ماسٹر، بیکس لڑکی، ضعیف باپ، بیوہ اور یتیم وغیرہ وغیرہ افراد مرکز توجہ بنائے گئے ہیں اور ان کے ذریعہ معاشرہ کی بے لوث عکاسی کی جا رہی ہے۔

سماج کے چھپے ہوئے ناسوروں سے اطللس و کم خواب کی پٹیاں ہٹا کر ان کی اصل گھناؤنی صورت مشاہدہ کرائی جا رہی ہے۔ صدیاں بیت گئیں یہ زخم اور ناسور آخر کب تک چھپے رہتے، کبھی نہ کبھی تو ان کا پردہ فاش ہونا ہی تھا۔ چنانچہ اس پردہ درمی کے نتیجہ میں دنیا میں عجیب بلجیل مچی ہوئی ہے۔ سارے کے سارے قدیم نظریات اور پرانی اقدار ٹوٹ رہی ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ذرہ پچ مقدار (ایٹم) کی دریافت نے تمام دوسرے آلات حرب و ضرب کو بے حقیقت اور غیر موثر بنا دیا۔ یہ لیکن جس طرح ایٹمی آلات کے ساتھ پرانی چیزوں کا بھی وجود باقی رہے گا اسی طرح ذہن میں ماضی کے لوگ بھی باقی رہیں گے کی وبیشی کا معاملہ البتہ ناگزیر ہو گیا ہے۔

آئندہ اوراق میں جن کرداروں کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ نہ سکندر اعظم ہیں اور نہ شہنشاہ اکبر۔ بقراط ہیں نہ حکیم بزرگ چمبر۔ بلکہ صرف ہم اور آپ ہیں۔ ہاں کچھ وہ ہیں جو راقم السطور کی طرح ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور دنیا نے ان

کو فراموش کر دیا اور کچھ ایسے ہیں جن کی خدا داد ذہانت و فطانت اور ذاتی محنت و کارکردگی بار آور ہوئی اور وہ قائد اعظم شہید ملت، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین بنگر بجا طور پر مشہور و معروف ہوئے۔ اس مجلس میں آپ کو سب قسم کے افراد ملیں گے، بالکل اسی طرح جس طرح ہماری سماج بھانت بھانت کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر شخص کسی نہ کسی ندرت خیال اور رعنائی گروا کا حامل ہے۔ اور اشخاص و افراد کا یہی تنوع اور رنگارنگی اس مجموعہ کا حقیقی حسن ہے۔

تمام صاحبانِ تذکرہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ان کی وائٹی جبرائی کا تاثر ہی "رسالہ مصنف" علی گڑھ اور "العلم" کراچی میں وقتاً فوقتاً ان پر کچھ لکھنے کا محرک ہوا۔ کسی پر کم لکھا اور کسی پر زیادہ، یہ کمی زیادتی اس لئے نہیں کہ وہ کم یا زیادہ لکھنے کے مستحق تھے بلکہ بس یوں ہی فوری جذبات کے تحت جتنا، لکھا جاسکا لکھ دیا گیا۔

اس مجموعہ میں آپ کی جن جن سے ملاقات ہوگی ان میں سے اکثر کے انتقال کی تلخ یادیں آپ کو یقیناً رنجور و طول کریں گی۔ لیکن المیوں سے ہم لاکھ بھاگیں ان سے مفر نہیں۔ علاوہ بریں جلا عنانِ ادب میں مسلمہ طور پر المیہ (ٹریجڈی) کو فوقیت بھی حاصل ہے۔ قلم کی شوخی و طراری اس کی خوں چکانی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نثر ہو یا نظم عظیم ادب آپ کو المیہ نگاری ہی میں ملے گا۔ کیونکہ وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ طنز و مزاح زیادہ تر مفروضہ اور سطحی ہوتا ہے اس سے اچھا ہوا دلتی سکون حاصل ہو جاتا ہے اور بس!

لیکن کسی تحریر کا مقصد قاری کو محض مسرور یا مغموم کرنا ہی نہ ہو بلکہ ہر
نگارش مقصدی اور تعمیری مقاصد کی حامل ہونی چاہیے۔ اس اعتبار سے ہماری
یہ ناچیز کتاب "راہی اور راہ نما" انشاء اللہ آپ کو مایوس نہ کرے گی۔

میں حقیر گدایانِ عشق را این قوم
شہانِ بے کمر و خروانِ بے کلمہ اند



”عہد نگش کی سیاسی علمی اور لغاتی تاریخ“

مؤلفہ: مفتی ولی اللہ فرخ آبادی
 مترجمہ: حکیم شریف الزماں اکبر آبادی
 مرتبہ: پروفیسر محمد ایوب قادری ایم، اے

جن اصحاب نے میری تالیف ”حیاتِ حافظ رحمت خاں“ مطبوعہ بار اول
 ۱۹۳۴ء و بار دوم ۱۹۶۳ء ملاحظہ فرمائی ہے، ان کو اندازہ ہو گا کہ کتاب میں
 نواب نجیب الدولہ اور ان کے جانشین نیز نوابان بنگش کے کافی حالات درج
 ہیں۔

۱۹۰۷ء میں حضرت اوزنگ زیب عالمگیر ج کے وصال کے بعد وہلی کی
 مرکزی حکومت کمزور ہو جانے کے باعث شمالی ہند میں روہیلی کنڈہ نجیب آباد
 اور فرخ آباد کی ریاستیں قریب قریب ایک ہی زمانہ میں عالم وجود میں آئی تھیں
 اور سرزمین ہند میں اسلام کی سر بلندی اور اُس کے اولوالعزم حکمرانوں کے
 کارہائے نمایاں کچھ اس طرح بے جملے ہوئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے
 علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اسی وجہ سے قدرتا میری یہ خواہش ہوئی کہ حیاتِ حافظ
 رحمت خاں کی طرح ایک ایک معیاری و مبسوط کتاب نواب نجیب الدولہ اور

تاریخ بنگلہ دیش پر بھی مرتب ہو جائے۔ لیکن اس کے واسطے ضرورت تھی کہ جس طرح حیاتِ حافظِ رحمت خاں کے لئے گلستانِ رحمت، گلِ رحمت، اور نقشِ سلیمانی وغیرہ۔ اصل ماخذ ہمدست ہو گئے تھے اسی طرح متذکرہ بالا خاندانوں کے حالات و واقعات پر مشتمل کیابِ قلمی کتاب میں بھی دستیاب ہو جائیں۔

یہ آرزو دل ہی دل میں موجزن تھی کہ اوائل جون ۱۹۳۹ء میں مجھے عزیز گرامی قدر مسٹر محمد مختار آزاد (ایم اے ایل ایل بی) (علیگ) حال لیبر لیڈر کراچی کی شادی میں قائم گنج خلیج فرخ آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا ہمیشہ سے یہ دستور ہے کہ جس جگہ بھی جاتا ہوں وہاں کی تاریخی عمارات دیکھتا ہوں اور اس مقام کے مشاہیر اہل علم سے ان کے مکانوں پر جا کر شرفِ نیاز حاصل کرتا ہوں یہ چیزیں نے حضرت نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان صاحب ثروانی مرحوم و مغفور سے سیکھی تھی۔ قائم گنج کی بابت بھی مجھے پہلے سے علم تھا کہ وہاں ایک بزرگ مولوی عبدالحافظ خاں نامی جو بخشی محمود خاں افریدی دیوان نواب محمد خاں بنگلہ دیش کی اولاد میں سے ہیں موجود ہیں۔

مولوی صاحب موصوف کے دیدار سے مشرف ہوا تو ان کی سراپا خلق اور معارف پور پاپا میری کتاب ”حیاتِ حافظِ رحمت خاں“ ملاحظہ فرما چکے تھے اور اس سے بے حد متاثر تھے، میں نے جب عرض کیا کہ میں اسی قسم کی ایک کتاب بنگلہ دیش پٹانوں پر بھی لکھنا چاہتا ہوں تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا

اے مولوی عبدالحافظ خاں صاحب کے تفصیلی حالات زندگی کے لئے دیکھو سہ ماہی

العلم کراچی بابت اپریل تا جون ۱۹۶۲ء

کہ ”میرے پاس بنگلوں سے متعلق ضروری قلمی کتابیں موجود ہیں جو میں نے آج تک کسی کو نہیں دیں، لیکن چونکہ آپ حیاتِ حافظ رحمت خاں لکھکر اپنا اعتبار قائم کر چکے ہیں اس لئے آپ ان کو مستعار لے جائیں جب آپ کا کام ختم ہو جائے تو میری کتابوں کو واپس کر دیجئے گا“

جناب مولوی عبدالحافظ خاں صاحب نے جو کتابیں مجھے عنایت فرمائیں

ان کے نام یہ ہیں:-

- ۱- تاریخ فرخ آباد فارسی قلمی از مفتی ولی اللہ
- ۲- وقائع خاندان نواب محمد خاں (قلمی) مکتوبہ منور علی خاں مولف

روح تاریخ

- ۳- تاریخ فرخ آباد (نقل قلمی) مؤلف ولیم ارون
 - ۴- ”نخستہ کلام“ قلمی فارسی مرتبہ منشی صاحب رائے
- ان کتابوں کی ندرت و اہمیت کا تفصیلی حال آپ محمد ایوب قادری صاحب کے دیباچہ کتاب مندرجہ عنوان میں ملاحظہ فرمائیں گے۔
- قائم گنج سے کتابیں لانے کے بعد نیک ارادہ کے باوصف کچھ بھی کام نہ کر سکا، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کی دفتری ذمہ داری اور میدانی کاموں میں ہمہ تن مصروفیت کے باعث وہ یکسوئی خاطر نصیب ہونا تھی نہ ہوئی جو ایک تحقیقی تصنیف کے لئے ضروری ہے۔

ترتیب کتاب کا کام ہاتھ میں نہ لینے کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ متذکرہ بالآنا خذوں کے علاوہ ایک اہم ماخذ تاریخ ”محمد خانی“ فارسی قلمی مؤلف

شیخ حسام الدین گوالیاری کی کمی شدت سے محسوس ہوتی رہی کیونکہ یہ بزرگ نواب محمد خاں اور احمد خاں بنگلشن کے ہم عصر تھے اور انہوں نے چشم دید حالات قلمبند کئے تھے۔ باقی سب کتابیں بعد کی تھیں۔ ولیم ارون نے اس کتاب سے کام لیا تھا، میں اسکو نظر انداز کر کے کس طرح قلم اٹھا سکتا تھا؟

اسی لیت ولعل میں سال پر سال بتینے لگے اور اس عرصہ میں مجھے قلبی رنج

وعدم پہنچا کہ میرے محسن جناب مولوی عبدالحافظ خاں صاحب کا نومبر ۱۹۶۷ء

میں بعمر ۷۸ سال انتقال بھی ہو گیا۔ اور مرحوم نے جو توقع قائم کی تھی اس کو میں

ان کی حیات میں پورا نہ کر سکا، اعتبار بے اعتباری میں تبدیل ہو گیا اور بجا طور پر

مولوی صاحب کے معزز صاحبزادگان جناب ابراہیم احمد خاں والیاس احمد خاں،

(الیاس مجیبی) نے مجھ پر اپنے والد مرحوم کی مستعار دی ہوئی کتابوں کی واپسی کا تقاضا

شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب تک کو جو ناہیانی سلسلہ

سے صاحبزادگان موضوعات کے ہم جہ ہیں مجھ پر واپسی کتب کے لئے اثر ڈالنے کی

نوبت آگئی۔

میری نیت میں کوئی کھوٹ نہ تھی لیکن میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ بغیر کچھ کے

ہوئے اگر یہ کتابیں ایک دفعہ ہات سے نکل گئیں تو پھر ان کا دستیاب ہونا اور

صحیح زاویہ نگاہ سے بنگلشن پٹھالوں کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ مذہب و

مطبوع ہونا ناممکن ہو جائے گا۔ لہذا اپنے کے مولوی خدابخش مرحوم کے ایجاد کردہ

مال مشول کے میں نے ساری ہی حربے تو استعمال کر ڈالے اور اس دوران میں

تاریخ بنگلشن پر اہم ترین کتاب نوشتہ مفتی ولی اللہ کا دفتر کانفرنس میں اپنے رفیق

جناب حکیم شریف الزماں صاحب شریف اکبر آبادی مرحوم سے اُردو ترجمہ کرنا شروع کر دیا اور دوسری کتابوں کی نقل کرائی۔

حکیم شریف الزماں صاحب فارسی کے ماہر، پورے منشی اور ایک بے نفس محنتی انسان تھے انہوں نے اس کافی ضخیم کتاب کے دفتر کے دفتر قلم برداشتہ ترجمہ کر ڈالے تا آنکہ آخری دو ابواب مقالہ وہم شعراء و خوشنویس اور یازدہم حالات مؤلف مفتی ولی اللہ فرخ آبادی ترجمہ ہونا باقی تھے کہ کتاب مع اپنی ساتھی کتابوں کے مجھ سے واپس لے لی گئی تھی

زور ہی کیا تھا جفاٹے باغیاں دیکھا کئے

بعد ازاں تقسیم ملک کی ہماہمی شروع ہو گئی جس نے حالت سکون کے سارے مشاغلِ علمی کو دور ہم برہم کر دیا، بھدا اللہ مسلمانان ہند کی ایک آزاد مملکت کا قیام عمل میں آیا اور جب میں جون ۱۹۵۷ء میں بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان حاضر ہوا تو جو تھوڑی سی کتابیں سینہ سے لگا کر اپنے ہمراہ لایا ان میں تاریخ بنگلہ سے متعلق متذکرہ بالا کتابیں بھی شامل تھیں لیکن بے سکرینی، اور عدم فرصت نے یہاں بھی پھیپانہ چھوڑا۔ علاوہ بریں نئے ملک اور نئی زندگی کے تقاضوں نیز قوائے جسمانی و دماغی میں اضمحلال کے باعث فرائض منصبی کا ادا کرنا ہی دشوار ہو گیا چہ جائیکہ کسی شوقیہ کام کے لئے وقت نکالا جاتا، عزیز می سید مصطفیٰ علی بریلوی بی۔ کام۔ ایل ایل۔ بی البتہ مذکورہ کتابوں کو پیش نظر رکھ کر بنگلہ حکمرانوں پر "العلم" میں وقتاً فوقتاً معلوماتی مقالے لکھتے رہے لیکن ایک مبسوط و بلند پایہ تحقیقی کتاب کی ضرورت اپنی جگہ پر بدستور قائم رہی تا آنکہ۔

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کے مصداق برادر مکرم پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے نے ۱۹۶۲ء میں اس اہم علمی کام کا بیڑا اٹھایا، برادر موصوف میری فرمائش پر قبل ازیں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی شائع کردہ کتاب "علم و عمل"، (وقائع عبدالقادر خانی) ایڈٹ کر کے علمی و تحقیقی دنیا میں نام پیدا کر چکے تھے، انہوں نے قریب دو سال کی محنت شاقہ کے بعد عہدہ ننگش کی ایک ایسی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ مرتب کر دی جو انشاء اللہ رہتی دنیا تک فیض بخش عوام رہے گی۔ بقولے

مشک آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید

مطالعہ کتاب سے ناظرین کرام کو اندازہ ہو گا کہ اس ہونہار مصنف نے تحقیق و تدقیق کا واقعی حق ادا کر دیا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ ۲۵ سال کے عرصہ میں ترتیب و طباعت کتاب میں جس قدر موانع بشمول میری کوتاہ قلمی پیش آنے وہ قدرت کی جانب سے اسی لئے تھے کہ ایوب قادری جیسا جفاکش، مستقل مزاج اور چابکدست نوجوان اس خدمت کو انجام دے اور.....

..... غلام مندوستان میں طبع ہونے کے بجائے اکیڈمی ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اس کو طبع کرانے کی سعادت حاصل کرے، اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ مسلمانان پاک و ہند ہنوز تشنہ تکمیل ہے۔ زیر نظر کتاب، بالخصوص اس کا علمی و ثقافتی حصہ طلباء و محققین تاریخ کی معلومات میں نہ صرف نئے اور اچھوتے مواد کا اضافہ کرے گا بلکہ تاریخ کا ایک قطعی گم شدہ ورق بھی ہمدست ہو گا جس سے عبرت بھی حاصل ہوگی اور

بصیرت بھی، ہمارے اسلاف میں سے صدہا با کمال گوشہ گنہامی سے نکل کر پہلی
 مرتبہ ضیاء حیات جاوید ہوں گے "خدا رحمت کندا واپس عاشقانِ پاکِ طنیتِ را"



آپ بیتی

(تصنیف: قاضی لطافت حسین دل ہاشمی بدایونی)

”سوانح عمری خودنوشت ہو یا کسی دوسرے کی عموماً بڑے آدمیوں کی لکھی جاتی ہے۔ بڑے آدمی بادشاہ و وزراء، فاتح، مدیر، سرمایہ دار، مذہبی رہنما، محققین اور موجدین ہوتے ہیں۔ جن کی تعداد عدد درجہ محدود ہوتی ہے ہمارے سماج میں غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے۔ جن کے کوائف حیات میں بظاہر کوئی ندرت نہیں ہوتی۔ اس لئے ہمارے صاحبان قلم ان کو عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ایک غریب و متوسط الحال شخص کن حالات میں اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ ترقی کی راہ میں کیا کیا موانع ہوتے ہیں اور ان موانع کو دور کرنے میں اُسے کیسی کیسی ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ انبائے زمانہ چھوٹے اور بڑے اس کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہیں۔ اچھے سلوک سے اس کے کردار کی تعمیر پر کیا اثر ہوتا ہے اور بُرا سلوک اس کو راہ نیک سے کیونکر بھٹکا دیتا ہے۔ اہل ثروت اور صاحبان اقتدار کے لئے جو چیزیں معمولی اور غیر اہم ہوتی ہیں۔ ان کے حصول میں ایک عامی کو کیسے کیسے پا پڑ بیٹے پڑتے ہیں۔ مثلاً اپنی اور اہل خاندان کی

قوت لایموت کے حقوق کے واسطے سو، دو سو یا چار پانچ سو ماہوار کی آمدنی مہیا کرنا، یا جسم و جان کی واجبی راحت کے لئے ایک اوسط درجہ کا مکان بنوالینا، بچوں کی تعلیم اور ان کو برسرِ کار کر دینے کی جہد میں فائز المرام ہونا، اہل محلہ اور اہل شہر کی نگاہوں میں کاروباری کامیابی اور اپنے حسنِ اخلاق و عزت و وقعت حاصل کر لینا ایک عام آدمی کے معمولی، کارنامے نہیں ہوتے۔

اگر ایسے شخص کو اس حد تک کامیابی حاصل ہو جائے کہ وہ مقامی میونسپل بورڈ یا ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری حاصل کرے۔ یا حکومت کسی خطاب یا اعزازی عہدہ سے بھی سرفراز کر دے تو سمجھنا چاہیے کہ بڑا کام ہوا۔ اور دوسروں کے واسطے اس کی زندگی قابلِ تقلید ہو گئی۔

جناب قاضی لطافت حسین دل ہاشمی صاحب بدایوں کے ایک پشتینی ذی علم خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ لیکن ان کو کوئی معقول جائیداد یا ایسا سرمایہ ورثہ میں نہ ملا تھا جس سے زندگی کی منزلیں آسانی سے طے ہو جاتیں۔ لہذا پوری عمر شدید محنت میں گزری۔ اور بالآخر انہوں نے اپنے آپ کو ایک شہرت یافتہ اخبار نویس، خطاب یافتہ معتمد شہری اور ایک فارغ البال بزدگ خاندان بنا کر دم لیا۔

کئی بار سخت جسمانی حادثے پیش آنے سے ایک ٹانگ بیکار ہو گئی لیکن ان کی الوالعزمی اور دوا دوش میں کمی نہ آئی۔ بدایوں اور اضلاع روہیلکھنڈ کے علاوہ لکھنؤ، الہ آباد، دہلی اور اب کراچی ان کی زبردست تگ و تازگی جو لائنگاہ ہے۔

۳۷ سال کی عمر ہے مگر دل جوان، ہمت بلند اور عزائم بے پناہ ہیں۔ بس نہیں چلتا کہ آسمان میں تھینگلی لگالیں۔ مشاغل تمام تر لکھنے پڑھنے اور صحافتی نوک جھونک کے جن کی بدولت رامپور کا دربار ہو یا گورنریو، پی کا ہمیشہ ممتاز و مفتخر رہے۔ اور اب بھی مولوی خصلت حسین صاحب ری ہوں یا مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی کسی کی مجال نہیں جو انھیں ٹیڑھی آنکھ دیکھ سکے ان کے ہاتھ میں ایک تیز و طرار قلم جادو و رقم جو ہے۔ ظاہر میں سخت و کمرخت، لیکن دل بچوں کی طرح معصوم، حق کی حمایت میں فیاض، اور ناحق کی بھینکنی میں بے جگر، ہر مصیبت زدہ کی، خدمت کے لئے آمادہ اور ایثار مجسم، لیکن ناشکروں اور نیکی کا بدلہ بدی سے دینے والوں کے لئے ظالم و بیدرد، لوگ نیک کاموں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اور تشدد کو خواہ وہ کیسا ہی حق بجانب ہو یا درکھتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے۔ ان کے باطن کی شرافت ظاہر میں نظر سے پوشیدہ ہو۔ لیکن ہاشمی صاحب کی یہ سوانح عمری ان کے متعلق نہ صرف ہر قسم کی غلط فہمی کو دور کر دے گی بلکہ اس کے ناظر بعد مطالعہ مجبور ہوں گے کہ ان کی دل سے عزت کریں اور ان سے محبت کریں۔

۱۵ خصلت حسین صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر ہزارس، کئی کتابوں کے مترجم (مؤلف ہیں) ابھی حال میں انکی کتاب مخزن الولاہیت (ملفوظات مخدوم صفی رح) شائع ہوئی ہے "مخدوم شاہ مینا کی تعلیمات" کانفرنس اکیڈمی نے شائع کی ہے ۱۵ مولوی محمد سلیمان بدایونی، قاضی لطافت حسین کے دوست اور بدایوں کے ذی علم رئیس تھے ان سے دو کتابیں "بدایوں ۱۹۵۷ء میں" اور "بدایوں ۱۹۴۶ء" میں یادگار ہیں۔ یکم جون ۱۹۷۳ء کو مکہ معظمہ میں انتقال ہوا۔

ہاشمی صاحب نے ہر واقعہ کو نہایت سچائی اور صاف بیانی سے تحریر کیا ہے۔ اگر ایک طرف اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو کھول کھول کر بیان کیا ہے تو دوسری جانب اپنے مخالف ہمعصروں کے افکار و اعمال پر بھی بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

کتاب کی زبان سلیس اور پراثر ہے۔ اور ایک قسم کے ڈرامائی انتظار و اشتیاق کی کیفیت قدم قدم پر پیش آتی ہے۔



۱۵ جناب ہاشمی صاحب کا ۱۵ نومبر ۱۹۵۶ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔

پاکستانی کلچر

تصنیف: سید جمیل جاہلی ایم، اے

جمیل جاہلی ایم اے۔ سی، ایس، پی، بابائے صحافت سید جاہل دہلوی مرحوم ایڈیٹر ہمدرد کے پوتے اور مشہور ادیب و نقاد جناب شاہد احمد دہلوی کے ایسے ہی جوڑی دار ہیں جیسے کہ کسی زمانہ میں مولانا سائلک و مہر تھے، جمیل صاحب شاہد صاحب کی طرح مضامین، تنقیدیں اور کتابیں کافی عرصہ سے خوب زور شور سے لکھ رہے ہیں۔ نہ صرف خود لکھ رہے ہیں بلکہ دوسرے لکھنے والوں کی سربراہی بھی کر رہے ہیں۔ خصوصیت سے ادارہ معنفین پاکستان (رائٹرس گلڈ) میں ان کی خدمات نہایت شاندار ہیں۔

متذکرہ بالا پوزیشن میں ہونے کی بناء پر جمیل جاہلی صاحب عصر جدید کی تمام علمی، ادبی اور ثقافتی تحریکات و رجحانات سے واقف ہیں چنانچہ انہوں نے بہت کچھ لکھنے لکھانے کے بعد روش عام سے ہٹ کر اب ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو حد و رجم دشوار ہے۔ ہماری مراد انکی تازہ ترین کتاب، پاکستانی کلچر سے ہے۔

جمیل صاحب کی یہ تصنیف کافی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ انہوں نے معاشرہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے خیالات میں غور و فکر نمایاں ہے۔ یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں ایک ہی طرز فکر ہے۔ موجودہ معاشرہ کی بگڑی ہوئی شکل سے بہت متاثر ہیں اور انداز نگارش ڈرامائی اور پراثر ہے۔ مصنف نے ایک بکھرے ہوئے اور گرتے ہوئے سماج کا تجزیہ بہت خوب کیا ہے۔ علاوہ ازیں پاکستانی معاشرہ کیسے وجود میں آیا؟ اور وہ کون سے عوامل تھے جو اس کا باعث بنے؟ کونسی اخلاقی اثرات کو زوال ہوا؟ اس پر تفصیلی بحث کی ہے جو کافی دلچسپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ کی عکاسی بچہ خوبصورتی سے کی ہے۔ لیکن کتاب پڑھنے کے بعد ہم ایک الجھن میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کوئی واضح شکل پاکستانی کلچر کی ہمارے سامنے نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کا کوئی کلچر ہے نہ کوئی تہذیبی سرمایہ اور نہ ہی آئندہ کا کوئی پروگرام۔ پوری قوم ایک قسم کے ابتلا میں گرفتار ہے۔ بقول مصنف پاکستانی غیر مہذب، جاہل، ان پڑھا اور علاقائی تعصب کا شکار ہیں۔ نہ ثقافتی ورثہ میں کچھ ملا ہے نہ یک جہتی ہے، نہ زندگی میں کوئی توازن ہے، بے چینی، بے اطمینانی، خود غرضی تضاد اور نفرت پاکستانی معاشرہ کی خصوصیات ہیں۔ اخلاقی طور پر لوگ پست ہیں۔ غرض یہ کہ پاکستانی معاشرہ کی یہ تصویر بہت بھیانک ہے۔ ان کے خیال میں پاکستانی معاشرہ میں بحران ہے۔ پوری کتاب پڑھ جائیے لیکن اس چیز کا کھوج نہیں ملتا کہ پاکستان کا بھی کوئی کلچر ہے یا نہیں۔ پاکستانیوں نے بھی گزشتہ سالوں میں کسی ثقافتی اور تہذیبی ترقی کا مظاہرہ

کیا ہے یا نہیں۔ اگرچہ کسی حد تک یہ درست ہے کہ ہم اپنا روایتی تہذیبی و ثقافتی سرمایہ ہندوستان میں چھوڑ آئے ہیں۔ لیکن کیا ہم زمانہ حال سے متاثر نہیں ہوں گے؟ کیا ہم کو ایک نئے معاشرہ کی تشکیل نہیں کرنی ہے؟ کیا ہم لکیر کے فقیر بنے رہیں گے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ مصنف کہنا کیا چاہتے ہیں؟ مصنف نے کلچر سے زیادہ اخلاقیات پر بحث کی ہے اور اس غلط بحث کی وجہ سے جگہ جگہ عبارت کا تسلسل ٹوٹ گیا ہے۔

کلچر کی وضاحت میں جو بحث انہوں نے کی ہے وہ قابل تعریف ہے لیکن یہ اچھا ہوتا کہ وہ تاریک پہلو لینے کے بجائے روشن پہلو پر نظر رکھتے اور اپنے خیالات کو عام فہم بناتے۔ ہم ان کی تائید کرتے ہیں کہ معاشرہ میں اخلاقی بُرائیاں سرایت کر چکی ہیں لیکن آج کے دور میں نہ صرف پاکستانی معاشرہ ہی بلکہ دنیا کا ہر معاشرہ اخلاقی اقدار ختم ہوتے دیکھ رہا ہے۔ اور اخلاق کا پرچار کرنے والے اپنے آپ کو مجبور اور بے دست و پا پاتے ہیں۔ اس کی وجہ زمانہ حاضرہ کے وہ تقاضے ہیں جنہوں نے اخلاقی اقدار کو بدل کر رکھ دیا ہے جو چیزیں آج سے تیس سال پہلے بری سمجھی جاتی تھیں آج اچھی سمجھی جاتی ہیں۔ بقول مولانا حالیؒ

ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

مصنف کے خیال میں پاکستانی معاشرہ میں بے چینی اور انتشار ہے اور

اس کی وجہ اخلاقی گراؤ ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم عصر حاضر کے تقاضوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً اٹیم بم کا

تجربہ اگر دنیا کے ایک کونے میں ہوتا ہے تو دنیا کے دوسرے حصے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی حال ہمارے کلچر کا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ پاکستان تہذیبی اعتبار سے ایک خلا کے ساتھ وجود میں آیا۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے :-

”ہمارے وسائل زرعی معاشرہ کے وسائل ہیں اور ہماری خواہشات صنعتی معاشرہ کی خواہشات ہیں اس اعتبار سے پاکستان میں غیر آسودہ خواہشات کا یہ تصادم اور تضاد زندگی کی ہر سطح پر ہمارے تخلیقی سوتوں کو خشک کر رہا ہے ہماری زندگی کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ کوئی جہت ہے۔ ہمارے سامنے تہذیبی سطح پر اقدار و اخلاق کا کوئی ایسا نظام نہیں ہے جس پر ہم مثبت طریقے سے زندگی کا کوئی نیا قلعہ تعمیر کر سکیں۔ اسی وجہ سے سارا معاشرہ منتشر ہے۔ ہر چیز کی اہمیت زیر و زبر ہے۔ ساری جمی جمائی اقدار ٹوٹ پھوٹ کر ایک ڈھیر بنی جا رہی ہیں۔ ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یا معنی اقدار کے پرانے ذرائع بے معنی ہو کر دم توڑ رہے ہیں۔ خیالات و عقائد کا وہ نظام جس پر ہم صدیوں سے یقین رکھتے چلے آ رہے تھے۔ اب ہمیں بے معنی اور ازکار رفتہ نظر آنے لگا ہے۔ اسی تہذیبی خلا کی وجہ سے ہم ایک طرف تو یورپ سے لباس، آداب معاشرہ، تعمیرات، فنون لطیفہ، مادی ترقی اور اخلاقی ضابطوں کی سطح پر شکست کھا رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے ذہنوں پر بد حالی اور پستی کے دبیر بد سے پڑ رہے ہیں اور ہم رفتہ رفتہ اس خزاں رسیدہ درخت کی مانند ہوتے جا رہے ہیں جس کے سب سے چھڑ گئے ہوں اور لٹمنڈ منڈ تنہا کھڑا ہو۔ سائے

معاشرہ میں اب کوئی چیز اپنی اصلی شکل میں نظر نہیں آتی۔
دوسری جگہ مصنف نے لکھا ہے :-

”یہ دماغی اصل اسی تہذیبی خلا اور اسی تضاد کا فطری ردِ عمل ہے جس سے آزادی کے بعد ہم دوچار ہیں۔ اسی وجہ سے سارا معاشرہ اور اس کے افراد جمود میں اُلٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کو تہذیبی خلا اور تضاد کا نقشہ دیکھنا ہو تو کسی سرکاری دفتر میں چلے جائیے، کسی تاجر اور صنعت کار سے مل لیجئے، کسی مزدور یا کلرک سے بات کر دیکھیے۔ کسی وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، صحافی، ادیب، طالب علم، مولوی یا سیاست داں سے گفتگو کر لیجئے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے ذہن میں نہ کوئی جہت ہے اور نہ کوئی مقصد۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے خود اس کی تردید کر رہا ہے۔ وہ تضاد کی جھلسا دینے والی آگ میں جل رہا ہے۔ جہاں نہ اُسے کوئی راستہ نظر آ رہا ہے اور نہ راہ فرار۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد حیات ہے کہ وہ خود کو کسی طرح محفوظ رکھے۔“

ہم جمیل صاحب کی ان آراء سے بالکل متفق نہیں ہیں۔ کیونکہ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو آئے دن نئی خواہشات پیدا کرتی رہتی ہے۔ وہ پیہم عمل اور کشمکش سے ترقی پاتی ہے۔ سکوت اور جمود اس کے لئے ستم قاتل ہے۔ یہ صنعتی دور ہے اور ملک کو صنعتی بنانا ہے۔ لہذا صنعتی خواہشات کوئی نئی چیز نہیں ہیں بقول ایٹ کلپر نام ہے طرز زندگی کا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے مصنفین اور شاعروں کی زندگی اخلاقی اعتبار سے معیاری نہیں ہوتی ہے۔ لیکن وہ قومی کلچر میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مغلیہ دور کی ثقافتی زندگی جو ہمارے خیال میں تمام

مسلمانوں کی ثقافتی زندگی تھی اس کو اخلاقی کسوٹی پر جانچا جائے تو ہمارا ثقافتی سرمایہ باقی نہیں رہتا ہے۔ کلچر کا تعلق اخلاقی اقدار سے صرف ایک حد تک ہے اگر کوئی قوم اخلاقی گراؤٹ میں مبتلا ہے تو اس کی وجہ معاشی بد حالی ہو سکتی ہے جو تخلیقی قوتوں کو اجاگر کرنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ثقافتی برکریا مائدہ پڑ جاتی ہیں۔ یہ چیز کہ ہم کو دوسری قوموں کے کلچر سے متاثر نہ ہونا چاہیے درست نہیں۔ کیونکہ آج کے دور میں ہم دوسری قوموں کے خیالات و نظریات سے غیر ارادی طور پر متاثر ہوتے ہیں، اس کی وجہ سائنسی ایجادات مثلاً ریڈیو، فلم اور اخبارات ہیں جو ہم کو ایک دوسرے سے باخبر رکھتے ہیں۔

جمیل جالبی صاحب نے قومی یک جہتی کے مسائل پر بھی بحث کی ہے۔ یہاں وہ کافی لچھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ علاقائی تضاد کو کافی اہمیت دیتے ہیں جو کسی حد تک درست ہے لیکن اس تفرقے میں بھی ایک ذہنی اتحاد پاکستانی ہونے کا موجود ہے جس کی مثال علامہ اقبال۔ نذر الاسلام، شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ جسیم الدین اور خوشحال خاں خشک وغیرہ سے لی جاسکتی ہے جن کے کلام میں جو مختلف زبانوں میں ہے، خیالات کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہی حال ہماری موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کا ہے۔

ایک اور باب میں مذہب اور کلچر پر بحث کی ہے۔ اس کے لئے جالبی صاحب واقعی قابل تحسین ہیں ہمارے خیال میں مذہب اور سائنس کا تضاد نہ صرف پاکستان بلکہ پورے ایشیا میں موجود ہے اور وہ دو اہم مسئلوں سے دوچار ہے اول یہ کہ یا تو سائنس اور ٹیکنالوجی کو قبول کریں اور اپنی دینی مذہبی روایتی

اقدار کو خیر باد کہیں اور اس کے جو بھی نتائج ہوں ان کو بھگتیں۔ دوسرے یہ کہ یورپ کے تجربہ سے فائدہ اٹھا کر اس چیز کو اپنالیں یعنی یہ کہ کوئی کلچر دور حاضر میں سائنس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور سائنس بذات خود ایک بہت بڑی جدید ثقافتی طاقت ہے جسکو ثقافت سے علیحدہ کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے مربوط کر کے ایک نئے کلچر کو جنم دیا جائے۔ پاکستان کو بھی اس صنعتی دور میں اسی قسم کے کلچر کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی ثقافتی اقدار میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو اس کا اچھا اور موزوں مقام دیا جانا ناگزیر ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم مغربی ماوریت کو بھی قبول کر لیں سائنس روحانیت کے منافی نہیں ہے کیونکہ پورا نظام قدرت خود خدا کا مظہر اور عکس ہے اسی چیز پر صوفیائے کرام نے کافی زور دیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثرات کا تجربہ کرنے پر معلوم ہو گا کہ صنعتی ترقی کی بدولت ہم اپنے روایتی نظام کو درہم برہم ہونے سے روک سکتے ہیں نیز نئے خیالات اور نظریات جو وجود میں آ رہے ہیں اور اچکے ہیں مثلاً ثقافتی آزادی اور جمہوریت وغیرہ ان سے اپنی ملت کو ترقی پذیر بنا سکتے ہیں۔

مرسید احمد خاں اور علامہ اقبال نے جو فلسفہ زندگی پیش کیا ہے اس کو ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنی عظمت رفتہ کو نہ ہرائیں اور ساتھ کے ساتھ اپنے آپ کو دوسری ترقی یافتہ قوموں سے پیچھے نہ رکھیں۔

آخر میں ہمارا خیال ہے کہ اگر کتاب کا نام "پاکستانی کلچر" کی بجائے "پاکستانی کلچر میں انتشار" یا "پاکستانی کلچر کی تلاش" ہوتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔

سرسید کا علمی کارنامہ

تالیف: قاضی احمد میاں جو ناگڑھی

فاضل یگانہ جناب قاضی احمد میاں اختر جو ناگڑھی مرحوم کی تحریر کردہ بہ کثرت چیزیں غیر مطبوعہ شکل میں ان کے بچوں کے پاس اور دوسرے مقامات پر بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ ۶ اگست ۱۹۵۵ء سے جبکہ ان کا انتقال ہوا سو وقت تک کوئی ایسی منظم تحریک روبہ عمل نہ آسکی جس کے ذریعہ ان کے تمام نتائج فکر مرتب و مطبوع ہو کر سامنے آتے۔ دو ایک کتابیں ضرور شائع ہوئی ہیں لیکن وہ "مشقے نمونہ از خروارے" کی مصداق ہیں۔

خود اپنے زیر اہتمام قاضی صاحب کے خطوط کی اشاعت کے بعد ہمیں خصوصیت سے ان کے اس محققانہ مقالہ کی تلاش تھی جو ان مرحوم نے "سرسید کا علمی کارنامہ" کے عنوان سے سپرد قلم کر کے ایک بار کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے منعقد کردہ "یوم سرسید" کے موقع پر پڑھا تھا اور پھر اپنے انتقال سے سے اکیس یوم قبل ۱۶ جولائی ۱۹۵۵ء کو میری ناچیز فرمائش پر کانفرنس اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے ایک جلسہ میں پڑھ کر سنایا تھا۔ یہ جلسہ ہمارے صدر جناب مولوی شمس الدین محمد صاحب سابق وزیر تعلیم بھاولپور کے دولت کردہ

واقعہ جمشید کوارٹرز کراچی میں منعقد ہوا تھا، جس میں میزبان محترم کے علاوہ
 ڈاکٹر عباد الرحمن خاں مرحوم۔ ڈاکٹر زبید احمد مرحوم۔ پروفیسر جلیل الرحمن اعظمی مرحوم
 ڈاکٹر مہدی حسن۔ مرزا علی اظہر برلاس۔ پروفیسر حافظہ شیدا احمد ارشد۔ میجر
 جنرل محمد اکبر خاں۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی۔ پروفیسر حبیب اللہ خاں
 غضنفر۔ پیر حسام الدین راشدی۔ آغا یعقوب دواشی، سید اظہر حسین رضوی،
 مولوی عظیم الدین خاں، حفیظ ہوشیار پوری۔ انعام عظیم برنی اور خاکسار
 نے شرکت کی تھی۔

مقالہ اس قدر معلوماتی اور معیاری تھا کہ اس کی یاد بھی دل سے محو نہ
 ہوئی۔ اور چونکہ متذکرہ جلسہ کے تین مہینے بعد ہی قاضی صاحب ہم سے ہمیشہ کے
 لئے جدا ہو گئے اس لئے اس کی دوبارہ زیارت نصیب ہونے سے قطعاً محرومی
 رہی۔ لیکن ابھی حال میں محب گرامی قدر جناب مشفق خواجہ صاحب اسسٹنٹ
 سکریٹری انجمن ترقی اردو مدیر ”قومی زبان“ سے قاضی صاحب کے اذکار میں
 ان کے اس مقالہ کا ذکر آیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ موجود ہے، اور آپ کے
 پاس بھجوادیا جائے گا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد قاضی کے صاحبزادے عزیز
 قاضی محمد اختر نے اس کو میرے حوالہ کر دیا۔ اور اب میں اسے اکیڈمی آف ایجوکیشنل
 ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے طبع کرا کر پیش کر رہا ہوں
 مقالہ کے نفس مضمون کا جہاں تک تعلق ہے قاضی صاحب کی یہ کاوش
 اس اعتبار سے اچھوتی کہی جاسکتی ہے کہ اس سے قبل ہم کو سرسید کی وسعت
 علمی اور ان کے تالیفی و تصنیفی کارناموں کا کبھی مواادہ دستیاب نہ ہو سکا تھا

حتیٰ کہ ان کی جملہ تصانیف کے نام تک معلوم نہ تھے۔
 اس کتاب کے ذریعہ پہلی بار قارئین کو معلوم ہو گا کہ سر سید نے کیا کیا
 لکھا۔ کس کس موضوع پر لکھا اور آئندہ اس بطل حلیل کی علمی خدمات پر سرسید
 کرنے کے لئے کس درجہ وسعت نظر کی ضرورت ہے۔



تجزیہ کلام غالب

(تصنیف: سید رفیع الدین بلخی)

اس کتاب کے مصنف سید رفیع الدین بلخی ایڈووکیٹ، مولوی سید حفیظ الدین بلخی کے صاحبزادے اور نواب امیر الدین صاحب کے نواسے تھے۔ ہم اکتوبر ۱۹۶۵ء کو بمقام نیورہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور آپ کے زمانہ تعلیم کے ایک ہم درس جناب مرزا علی اظہر صاحب برلاس اور ان کے استاد جناب خان بہادر مرزا ابو جعفر صاحب کشتفی جو آج بھی کراچی میں قیام پذیر ہیں بلخی صاحب مرحوم کی محبت، اخلاص، منکسر المزاجی، ذوق ادب اور حبّ قومی کے معترف ہیں۔ بلخی صاحب پٹنہ کے نامور ایڈووکیٹ تھے جس کا سرسری اندازہ ذیل کی چند تحریروں سے ہوگا جو بہار کے مشاہیر قانون پیشہ اصحاب نے ان کے متعلق سپرد قلم فرمائی تھیں۔

جناب سید عبد العزیز صاحب مرحوم | سید رفیع الدین بلخی کے اعلیٰ کردار کی تصدیق کرنے میں مجھے دلی مسرت ہے۔ میں ان کو بچپن سے جانتا ہوں۔ میں نے ان کی کالج

اور پرائیویٹ زندگی کو قریب سے دیکھا اور اس کو قابل ستائش پایا ہے۔
یہ بہت محنتی نوجوان ہیں۔ اعلیٰ نصب العین کے مالک ہیں اور ان کا تعلق
ایک ایسے معزز خاندان سے ہے جس سے اہل صوبہ بخوبی واقف ہیں۔

(دلکشا پٹنہ - ۲ اگست ۱۹۲۶ء)

ایم رفیع الدین بلخی میری عدالت کے
فوجداری مقدمات میں وکالت کرتے
رہے ہیں۔ اور انھوں نے بحیثیت ایک

مسٹر جی پولینڈ، ڈسٹرکٹ
وسیشن جج پٹنہ

ہو نہار جو نیر پلیڈر مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

(پٹنہ سیشن کورٹ ۱۵ جولائی ۱۹۳۲ء)

ایک مقدمہ دیوانی جس میں کہ مجھے آپ کے
ساتھ کام کرنے کی مسرت حاصل ہوئی۔

مسٹر جسٹس منوہر لال

میں آپ کی قابلیت اور محنت شاقہ سے بحد متاثر ہوا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ
اپنے پیشہ وکالت میں سرعت کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔

(پٹنہ ہائی کورٹ ۹ جولائی ۱۹۳۴ء)

مسٹر رفیع الدین بلخی سے بخوبی واقف ہوں۔

مسٹر جسٹس جعفر امام

وہ میرے عزیز ہیں اور میرے والد مسٹر علی امام

مرحوم ان سے بہت عزت اور محبت سے پیش آتے تھے، مجھے یہ بھی عرض کرنا
ہے کہ مسٹر بلخی ایک ایماندار، اصول پرور، ذہین و طباع، قابل اور جفاکش
انسان ہیں یہ دوسروں کی کاروباری کسے حسن تدبیر اور احساسِ فرض کی

صفات سے بھی متصف ہیں، جن کی وجہ سے وہ ہر شخص کے محبوب ہیں۔ میں
دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی زندگی میں کامیاب ہوں۔ اور اللہ کے فضل کے
مورد ہوں۔ (پٹنہ ہائی کورٹ ۱۱ فروری ۱۹۳۶ء)

مجھے اس امر کے تصدیق کرنے میں بہت مسرت
مسٹر جسٹس سچانند سنہا ہے کہ مسٹر رفیع الدین بلخی سے میں پندرہ سال

سے زائد عرصہ سے واقف ہوں۔ وہ متعدد اعتبارات سے غیر معمولی صفات
کے حامل ایڈووکیٹ ہیں۔ ان کا اخلاق دل آویز اور ان کی تقریر اثر انگیز
ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بڑے باتسیر اور سماج کے ہر طبقہ میں انتہائی ہرول عزیز
ہیں۔ میری رائے میں ان کے کمالات اور مختلف میدان ہائے عمل میں تجربہ
کی بنا پر انھوں نے اپنے آپ کو اعتماد اور ذمہ داری کی اعلیٰ پوزیشن کا،
اہل ثابت کیا ہے۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ وہ اعلیٰ ترین کردار کے مالک ہیں۔
(پٹنہ ہائی کورٹ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۶ء)

اپنے قانونی پیشہ میں مقام رفیع حاصل کرنے کے علاوہ جس کی
مشتمل نمونہ از خروارے، مندرجہ بالا اسناد سے تائید ہوتی ہے۔ سید
رفیع الدین صاحب بلخی پٹنہ اور بہار کے علمی حلقوں میں بھی ہرول عزیز تھے۔
ذوقِ ادب اور معارف پروری ان کی طبیعت ثانیہ تھی جس کی وجہ سے دور و
نزدیک کے اہل علم آپ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

افسوس ہے کہ ایسے قیمتی وجود کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا اور صرف
۵۲ سال کی عمر میں بتاریخ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ

کے انتقالِ بجلال پر بزمِ احباب پٹنہ اور دوسرے اداروں نے جلسہ ہائے تعزیت میں اظہارِ غم و اندوہ کی تجاویز پاس کیں اور ان کے شعراء احباب نے قطعاتِ تاریخ و فات لکھے۔

اس موقع پر جناب پروفیسر جمیل منظرہری (پٹنہ یونیورسٹی) نے جو درو

انگریز نظم تحریر فرمائی تھی درج ذیل ہے :-

حیف اے ساتی اے خانہ اخلاص رفیع	بزمِ احباب ہر اک بزمِ عزتیرے بعد
شامِ اجڑی ہوئی بیوہ کی طرح سوگ نشیں	جامِ ابلتے ہوئے، مینا سے خفا تیرے بعد
کس قدر سست ہر آہنگ لڑائے ہر ساز	کس قدر گنگ ہر محفل کی فضا تیرے بعد
موت نے ہم سے تجھے لے ہی لیا آخر کار	ہوئی رسوائی ناموس و عسائیرے بعد
بچھ گیا ولولہ دوست نوازی لے دوست	کیا جئے حوصلہ صبر و وفا تیرے بعد
وائے محرومی جذباتِ خلوص و ایثار	وائے افسردگی صدق و صفا تیرے بعد
جمع ہوں آکے جہاں مختلف الذوق احباب	آج ایسا کوئی مرکز نہ رہا تیرے بعد
یاد آیا، ہمیں بیساختہ غالب کا وہ شعر	جس کے الفاظ کو مفہوم ملا تیرے بعد

”تو تھا گلدرستہ احباب کی بندش کی گیاہ

منتشر ہو گئے تیرے رفقا تیرے بعد

سید رفیع الدین بلخی صاحب کے مورت اعلیٰ مولانا مظفر الدین بلخی اور دوسرے صاحب کشف و کرامات بزرگوں کے حالات چونکہ نہایت تفصیل کے ساتھ تاریخ سلسلہ فرودستیہ از معین الدین دسوائی ایم، اے علیگ،

کتاب منزل - باری روڈ گیا - بہار میں شائع ہو چکے ہیں اس لئے اس اجمالی تعارف میں ان کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ بلخی صاحب مرحوم کی زیر نظر کتاب پر جناب سید علی حسنین زیبارو لوی نے نہایت عالمانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے جس سے اس کے محاسن پر بھرپور روشنی پڑتی ہے

آخر میں مجھے منجانب کانفرنس اکیڈمی جناب مسلم خلیفہ ایم، اے اور جناب سید علی حسنین زیبارو لوی ایم، اے کا خصوصی شکریہ ادا کرنا ہے۔ جنہوں نے علی الترتیب مسودہ پر نظر ثانی اور تحریر "مقدمہ" کی خدمات عالیہ انجام دے کر کتاب کی قدر و قیمت میں بیش قرار اضافہ فرمایا۔ اللہ سی دعا ہے کہ مرحوم مولوی سید رفیع الدین بلخی کی یہ اولاد معنوی (کتاب تجزیہ کلام غالب) عوام و خواص میں مقبول ہو اور ان کا نام نیک ناما ابد الابد قائم رہے۔ آمین۔

بچہ کار آیدت ز گل طبقہ
از گلستان من بہر ورقتے
گل ہمیں ہر روز و شمش باشد
دین گلستاں ہمیشہ خوش باشد

روزگارِ فقیر

(جلد اول و دوم)

مصنف: فقیر سید وحید الدین

فقیر سید وحید الدین صاحب سے ہمیں کبھی بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا، البتہ ایک صنعت کار کی حیثیت سے اور اس حیثیت سے کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ سابق حکمران پنجاب کے وزیر مملکت فقیر عزیز الدین مرحوم کی اولاد میں سے ہیں اور ان کے یہاں لاہور میں ایک ناور کتب خانہ، قدیم اسلحہ اور دیگر لوازمات بڑی تعداد میں محفوظ ہونے کا غائبانہ علم تھا، کتاب روزگارِ فقیر کے بالاستیعاب مطالعہ سے سید صاحب سے بھرپور واقفیت ہوئی اور ہمیں یہ محسوس ہو کر واقعی فخر ہوا کہ ہمارے ملک کے سرمایہ دار طبقہ میں ایک ایسی اولوالعزم، صاحب ذوق اور ذی علم شخصیت بھی موجود ہے جو نہایت خاموشی کے ساتھ اس قسم کا معرکہ الاراء علمی کا زمام انجام دے سکتی ہے۔

سب سے پہلے کتاب کا حسن طباعت جاذب نظر ہے۔ کم از کم ہماری نظر سے اردو کی کوئی دوسری کتاب اس قدر خوب صورت چھپی ہوئی نہیں

گذری۔ اس کو ہاتھ میں لیتے ہی آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح اخبار "تحریت" کراچی کے اجراء کے بعد پاکستان کا ہر ایک اردو روزنامہ صوری اور معنوی اعتبار سے اپنا معیار بلند کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اسی طرح فقیر سید وحید الدین صاحب نے اردو کی اچھی کتاب چھاپنے کا ایک ایسا معیار تمام پبلشروں کے لئے قائم کر دیا ہے کہ اس تک پہنچنا آئندہ ان کے لئے ناگزیر ہو گا اور یہ چیز اردو کی مقبولیت میں بہت کچھ عمدہ معاون ہو گی۔

متن کتاب کا جہاں تک تعلق ہے۔ سو اس میں بھی جدت و ندرت کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہر مضمون یا کتاب کی پہلے لمبی لمبی بہاریہ قسم کی تمہیدیں ہوتی تھیں۔ بالخصوص سوانح عمری کے سلسلے میں ایک بنا چھنا جو شاندار سے کا نسخہ تھا کہ اس میں بالترتیب، خاندان، ولادت، ابتدائی تربیت، تعلیم، ملازمت یا روزگار، شادی اور اس کے بعد اس کے کارنامے اور اوصاف و اخلاق درج کئے جاتے تھے۔ لیکن کافی عرصہ سے یہ طرزِ تحریر ترک کر دیا گیا ہے۔ اور نفس مضمون کو بغیر حشو و زوائد اور عبارت آرائی سے مبرا کر کے کسی بے ساختہ اور برجستہ فقرے سے شروع کر دیا جاتا ہے اور فوراً نفس مضمون پر جو کچھ لکھنا ہوتا ہے اس کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔

فقیر سید وحید الدین صاحب نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور جس طرح آزاد شاعری بجز و توانی کی پابندی نہیں ہوتی اسی طرح اپنی کتاب

کو سید صاحب نے ہر قسم کی ترتیب اور بندش سے بے نیاز رکھا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جس طرح بھولی پسری یا دیں انسانی دماغ میں وارد ہوتی ہیں جن کی کوئی ترتیب اور تنظیم نہیں ہوتی لیکن بہر حال وہ بہت عزیز ہوتی ہیں بالکل اسی طرح سید وحید الدین صاحب نے شاعر مشرق علامہ اقبال رحمت اللہ علیہ کے بارے میں جو کچھ انہوں نے دیکھا یا دوسروں سے سنا اس سب کو بجنسہ جمع کر دیا۔ پہلے زمانے میں خوبصورت عمارتوں کا حسن ہر چیز کے جواب اور یکسانیت (سیمٹری) میں سمجھا جاتا تھا اور آج کل ہر چیز کو ایک دوسری کی عمد اور اس کے اختلاف کی شکل میں ظاہر کرنا خوبصورتی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے۔ سید صاحب نے بھی اپنی کتاب میں آخر الذکر روش کو اختیار کر کے اپنے ”آپ ٹو ڈیٹ“ ہونے کا ثبوت دیا ہے اور مضامین کو مسلسل اور ایک دوسرے سے مربوط نہ کر کے ایک ایسا گلدستہ بنا دیا ہے جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول سجائے گئے ہوں۔

کتاب کے دونوں حصوں میں حضرت علامہ اقبال کے ذاتی حالات نہایت جوش و عقیدت کے ساتھ فراہم کیے گئے ہیں جن میں سے اکثر پہلی بار پڑھنے میں آئے اور ان کے مطالعہ سے اس عظیم المرتبت فلسفی اور مصلح شاعر کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا۔ یہ بھی آئندہ نسلوں پر بڑا احسان کیا گیا ہے کہ علامہ مرحوم کی بشری کمزوریوں کو اچھانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کتاب از اول تا آخر چھوٹی چھوٹی اثر انگیز کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ ایک ایسا اسلوب نگارش ہے کہ اس کے ذریعہ فارسی علامہ اقبال سے قریب تر

ہوتا چلا جاتا ہے۔ کتاب میں مندرجہ ذیل واقعات کا خصوصیت سے ہمارے
دل پر اثر ہوا۔ روزگار فقیر جلد دوم ص ۱۷۷ احترام رسول کے ذیل میں درج

ہے :

”ایک روز حکیم احمد شجاع علامہ کے مکان پر پہنچے تو ان کو بہت
زیادہ فکر مند، مغموم اور بے چین پایا۔ حکیم صاحب نے گھبرا کر دریافت کیا
”خیریت تو ہے، آج آپ خلاف معمول بہت زیادہ مضطرب اور پریشان
نظر آتے ہیں“ علامہ نے خاص انداز میں نظریں اوپر اٹھائیں اور غم انگیز لہجے
میں فرمایا۔ ”احمد شجاع! یہ سوچ کر میں اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ
کہیں میری عمر رسول اللہ کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے“ چنانچہ یہی ہوا بھی کہ
اُس عاشق رسول کی عمر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سن مبارک سے
دو سال کم یعنی اسیٹھ سال کی ہوئی اور گویا اللہ تعالیٰ نے علامہ کی اس تمنا
اور دعا کو قبول فرمایا۔ سچ ہے یہ

بدنیاگر کسے پائندہ بودے

ابوالقاسم محمد زندہ بودے

دوسرا واقعہ اس چیز سے متعلق ہے کہ جب کوئی شخص بہت مشہور

اور بڑا آدمی ہو جاتا ہے تو وہ اپنے کم علم اور غریب اقربا کی صحبت سے اجتناب
کرنے لگتا ہے۔ لیکن علامہ اقبال کی یہ عادت تھی کہ ”جب وہ عدالتوں کی

چھٹیوں میں لاہور سے اپنے وطن مالوٹ سیالکوٹ تشریف لاتے تو وہ پھر
کے کھانے کے بعد یا پہلے روزانہ محفل جمعی جس میں بے حد علم والے حضرات

پھوپھیاں۔ بھاوج اور چچیاں شامل ہوتیں۔ علاحدہ پلنگ پر لیٹے ہوتے اور مستورات
تخت کے فرش پر ارد گرد بیٹھ جاتیں۔ علمی گفتگو کا تو اس محفل میں کیا ذکر بس ادھر
اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں ہوتیں۔ محلہ بھر کے قصے۔ برادری کے قصے بڑے شوق سے
سننے۔ ایک مسکراہٹ اُن کے لبوں پر کھیلتی رہتی۔ بعض اوقات خود پوچھتے
”اچھا ابے جی۔ فلاں ساس بہو کی لڑائی میں آپ نے کیسے صلح کرائی؟“

(روزگار فقیر جلد دوم صفحہ ۱۳۶)

”اقبال بحیثیت انسان“ کی اس سے بہتر تصویر کشی نہیں ہو سکتی۔

فقیر وحید الدین صاحب کی کتاب سے ہی ہمارے مخدوم جناب ممتاز
حسن صاحب اور سید امجد علی صاحب کی حضرت علامہ سے والہانہ عقیدت و ارادت
کا پس منظر بھی پہلی بار معلوم ہوا۔

جناب فقیر سید وحید الدین صاحب سے ان کی اس قابل قدر کتاب
کے سلسلہ میں ایک شکایت بھی ہے۔ جس نے حصہ دوم کے اختتام پر ہمارا سارا
مزہ کر کے اُڑا دیا اور وہ غیر مطبوعہ کلام اقبال کا اندراج ہے۔ جس کلام کو علامہ
نے خود ترک کر دیا تھا اور اپنی کتابوں میں اُسے جان بوجھ کر شامل نہیں کیا
تھا، اس کو تحقیق مزید کے جوش میں بلاوجہ چھاپ کر ان کی عار فائدہ اور مصلحانہ
شہرت کو مجروح کیا گیا ہے۔ علامہ کے متروک کلام کا بیشتر حصہ ان کو عام شعرا کی صف
میں کھڑا کر دیتا ہے۔ دراصل ہمیں علامہ کے صرف اسی کلام کی ضرورت ہے جس
نے ان کو شہرت و دام بخشی ہے، نہ اس کلام کی جس سے ان کے پیغام اور
نفاذگی کے حقیقی مشن کی تکذیب ہوتی ہو۔ ہمیں توقع ہے کہ جناب فقیر سید وحید الدین
صاحب ایسے تمام کلام کو آئندہ اشاعت میں نظر انداز کریں گے۔ اسکا نسیا منسیا رہنا ہی

اقبال کے تعلیمی نظریات

تصنیف: مسٹر محمد احمد صدیقی ایم. اے

کتاب زیر نظر کے مؤلف مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں اور ان کی زندگی کا خاص مشن یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کی اشاعت و توسیع اپنی زبان، اور قلم سے کرتے رہیں۔ آپ کی ذہنی نشوونما علی گڑھ کی فضا میں ہوئی۔ خود ان کا قول ہے کہ "علی گڑھ کے دروازوں میں چھپا ہوا کائنات بھی اس نیاز مند کے لئے محرک فکر و عمل ثابت ہوا ہے، اکتھیر آپ کی زبان پر یہ شعر رہتا ہے۔

علی گڑھ کی فضاؤں نے یہ سوز جاوداں بخشا
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ چشم گریاں کو

صدیقی صاحب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو ادبی خدمات

اور معارف پروری کے لئے مشہور رہا ہے۔ ساتھ ہی اس خاندان میں مردان عمل کی بھی کمی نہیں رہی۔ آپ کے مورث اعلیٰ سلطان محمد تعلق کے عہد میں ترکستان سے ہندوستان آئے اور منصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ ان کے دادا قاضی زین العابدین کا شمار اپنے وقت کے جید علماء اور فضلاء میں ہوتا تھا۔ سرسید تحریک سے ان کا بہت قریبی تعلق رہا اور اکثر اہم معاملات میں مراسلت

ہوتی تھی۔ مولانا حالی، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم، نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد آپ کی علمی قابلیت اور فارسی شاعری سے بالخصوص بہت متاثر تھے۔ آپ کے حقیقی پرانا حافظہ محمد وحید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت سید احمد شہید بریلوی کے ساتھ بالاکوٹ کے جہاد میں شریک ہوئے اور وہاں سے واپسی پر مجاہدین کے قافلہ کے ساتھ ٹونک آکر سکونت اختیار کر لی۔ ٹونک کے حکمرانوں نے آپ کی اور آپ کے اسلاف کی ہر طرح سے خدمت کی آپ کے والد قاضی منیر العابدین صاحب نے فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور بھوپال میں وحید یہ اسکول کے پرنسپل بن گئے، آپ ابھی بقید حیات ہیں اور نہایت متقیانہ زندگی گزار رہے ہیں۔

محمد احمد صدیقی صاحب اس وقت کراچی میں ایک سرکاری اسکول سے منسلک ہیں اور فرائض مرفوضہ سے وقت نکال کر تصنیفی اور تالیفی کام بھی جاری رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنا پہلا تحقیقی مقالہ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم پر جناب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی زیر نگرانی مرتب کیا تھا۔ سہ ماہی رسالہ "العلم" میں آپ کے علمی اور تعلیمی مضامین کبھی کبھی چھپتے رہتے ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پاکستان کے تعلیمی مسائل پر آپ کو خاص ذراک ہے۔ تعلیمی اصلاحات کے کمیشن کی سفارشات سے پہلے ہی آپ نے ان مسائل پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اقبال آپ کے مطالعہ کا خاص عنوان ہے اور اقبال کے فلسفہ تعلیم سے آپ کو شغف ہے۔

جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان نے تعلیمی اصلاحات نافذ فرمائیں تو آپ کو اس میدان میں اور زیادہ کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ تعلیمی کمیشن کی سفارشات کو عوام کے ذہن نشین کرنے کے لئے آپ نے بڑی محنت اور خلوص سے ان کی تشریح اور ترجمانی کرنے کے لئے کتابیں مرتب کیں۔ حال میں "پاکستان کا جدید قومی نظام" کے نام سے ایک نئی کتاب شائع کی ہے جس میں تعلیم کے مختلف مدارج، نظریات اور طریقہ ہائے تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔ غرض کہ پاکستان کے نظام تعلیم اور درسی و تدریسی پہلو پر آپ کے مضامین، تالیفات اور تصنیفات سے حاصل کیے گئے مجموعے ہو گیا ہے۔ جن سے تربیت پانے والے اساتذہ بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتاب زیر نظر "اقبال کے تعلیمی نظریات" بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔

جناب خواجہ غلام السیدین کی مشہور کتاب "اقبال کا نظریہ تعلیم" علامہ مشرق کے تعلیمی افکار و خیالات کی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اسی کی اساس پر صدیقی صاحب نے اس کتاب کو تالیف کیا ہے جو اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس کے زیر اہتمام شائع کی جا رہی ہے یقین ہے صدیقی صاحب کی اس کامیاب کوشش کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔



انوار الصفا

(تالیف: مولوی خصلت حسین صاحب صابری)

کتاب انوار الصفا مولوی خصلت حسین صاحب صابری کی ایک قابل قدر اور لائق اعتناء تالیف ہے۔ جس میں مؤلف نے سب سے اول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس احادیث جو تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی نکات و رموز پر مشتمل ہیں تبرکاً و تمیماً زینت کتاب کی ہیں۔ بعد ازاں صحابہ کبار اور تابعین و تبع تابعین اور برصغیر پاک و ہند کے اولیائے کرام و صوفیائے عظام کے مختصر حالات زندگی، اقوال و کردار اور ان کی عملی زندگی کے خاکے پیش کئے ہیں۔ اگرچہ صحابہ اور صوفیائے کرام کے حالات و واقعات پر بشمار کتب زبان اردو میں موجود ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن موجودہ کتاب مولوی خصلت حسین صاحب کی پوری علمی زندگی کے مطالعہ کا حاصل ہے جس میں انہوں نے بکثرت جواہر پاروں کو فراہم کر کے اور ان کو موجودہ کتابی شکل میں عوام و خواص کے فائدے کے لئے مرتب و طبع کرا کے ایک بڑے اجر و ثواب کا کام کیا ہے۔

ہمارے ملک پاکستان کو جس کی بنیاد ہی اسلامی نظریہ حیات پر

قائم کی گئی ہے ایسے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے کیونکہ موجودہ زمانہ کے طلباء اور
دفتری دنیا کے لوگ جاسوسی ناولوں یا جنسی خواہشات کو انگریز کرنے والے
مغربی ادب سے ذوق رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کا اخلاقی معیار روز بروز
تتنزل پذیر ہو رہا ہے، ان کے نزدیک اخلاق و تمدن کا معیار یورپ و امریکہ
کی ہر بات کی کورائے تقلید پر ہے۔ وہ مشرقی تمدن و اخلاق کو کم نگاہی سے
دیکھتے ہیں اور تقلید مغرب کو سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں، ایسے مسموم ماحول میں
اس قسم کی کتب کا شائع ہونا اور نوجوان طلباء کے زیر مطالعہ آنا تریاق کا
اثر رکھے گا اور نوجوانوں کی بے راہ روی کے متعدی مرض کے لئے اکیڑ ثابت
ہوگا۔ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کی دینی اور دنیوی فلاح و بہبود صرف
حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ و تابعین اور دیگر ائمہ
وصوفیائے سلف کی تقلید و اتباع میں ہے نہ کہ یورپ و امریکہ کے اخلاقی
اعتبار سے کم کردہ راہوں کی اقتداء میں سے

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اسے اعترابی

کین رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

فاضل مرتب کتاب، جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کے
علاوہ فارسی ادب کے پرانے خواص ہیں، اس پر مستزاد موصوف نے
دینی بالخصوص متصوفانہ لٹریچر کا وسیع و عمیق مطالعہ کیا ہے اس لئے ان
کی کتاب زبان و بیان کے جملہ محاسن سے آراستہ ہے۔ فی زمانہ جبکہ کم علمی
ہی ہر طرف کا غدی پیرہن میں ملبوس نظر آتی ہے جناب عباسی صاحب

جیسے صاحبِ نغز و مغز کی اس بلند پایہ کتاب کا منصفہ شہود پر آنا بڑی ہی خوش نصیبی کی بات ہے، امید ہے کہ نوجوان طبقہ عموماً اور طالبانِ علم خصوصاً اس کتاب کے مطالعہ سے اپنی عملی زندگی کو سنوار کر سعادت دارین حاصل کریں گے۔

فاضل مصنف کی درج ذیل کتابیں بھی قابلِ مطالعہ و استفادہ ہیں:-

۱۔ عرفانِ عزیز :- انتخابِ کلامِ اردو حضرت محمد ولایت علی ولایت معروف بہ عزیزِ صفی پوری۔

۲۔ نغمہ شفاعت :- انتخابِ کلامِ فارسی حضرت محمد ولایت علی ولایت معروف بہ عزیزِ صفی پوری

۳۔ مخزنِ الولایت :- فارسی ملفوظاتِ شاہ خادمِ صفی پوری محمدی پیر مرشد حضرت عزیزِ صفی پوری

اردو ترجمہ :- مرتبہ حضرت عزیزِ رح

۴۔ تعلیماتِ شاہِ مینارج :- اقتباسِ فارسی ملفوظاتِ شاہِ مینا سمی بہ فوائدِ سعیدیہ، ترجمہ مجمع السلوکِ عربی

۵۔ قدین :- الف بائے حضرت شاہِ رحمن رح، سندِ پوری تصوف کے مسائلِ نظم مع شرحِ شاہِ خادمِ صفی پوری

انشائیے

(تصنیف: فضل احمد حسد یقی ایم۔ اے)

ہر زبان کی ترقی اور ارتقاء میں انشائیہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر ترقی یافتہ صالح ادب میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے یہ حقیقت ہے کہ زبان کو ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کے اظہار کے قابل بنانے کے لئے اور اس کو ایک مخصوص اور منفرد انداز نگارش دینے کے لئے انشائیہ ایک ضروری آلہ ہے۔ انشائیہ کی خصوصیات یہ ہیں کہ نہ صرف مشاہدات و تجربات ذاتی کو اختصار اور بلاغت کے ساتھ عام فہم زبان میں بیان کرے بلکہ صاحب نگارش کے دل و دماغ پر بیرونہ مشاہدات کے جو اثرات پڑتے ہیں ان کی صحیح عکاسی کرے۔ انشائیہ درحقیقت نثر کی ایک اہم صنف ہے، انگریزی کا ایک مشہور نثر نگار ڈاکٹر جانسن (DR. JOHNSON) اس زبان کے ابتدائی انشائیہ نگاروں میں، تھا۔ اس کا خیال ہے کہ انشائیہ کے لئے کسی مربوط سلسلہ و خیال اور تسلسل افکار کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن انگریزی کے دوسرے مشہور انشائیہ نگاروں کے شاہکاروں کو جب ہم پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں

یہ خوبیاں بھرپور طریقہ پر پائی جاتی ہیں اور انہی کی بنا پر ان کی تخلیقات کو بقائے دوام حاصل ہوئی ہے۔ انشائیہ کی ہیئت ترکیبی اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس میں گہرے تخیل اور سوچ بچار کا رنگ نہ بھرا جائے اور اظہار خیالات کے لئے سادہ اور براہ راست، دل پر اثر انداز ہونے والی طرز نگارش اختیار نہ کی جائے۔

یورپ کے علمائے لسانیات و ادب کا خیال ہے کہ وہاں جسٹین انشائیہ نگاری کی ابتدا فرانس کے مشہور اہل قلم مان ٹین (MONTAIGNE) نے کی، اس کو اپنی اس تخلیق پر ناز تھا اور اس کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ ایجاد انسانی فطرت کے مقتضیات کی اشاعت کا ایک مفید اور دل چسپ ذریعہ ہے۔ مانٹین (MONTAIGNE) کی دماغی اختراعات انگلستان میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں اور ان کا اتباع بھی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ، انگلستان کے انشائیہ نگار بیکن (BACON) کی تصنیفات میں مانٹین (MONTAIGNE) کی جھلک نظر آتی ہے۔

اٹھارویں صدی میں انگریزی ادب میں انشائیہ نگاری نے ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ اس کی ترقی اور ہرول عزیز میں انگلستان کی صحافت سے بڑی مدد ملی انگریزی رسالہ ٹیٹلر (TATLER) اور اسپیکٹیٹر (SPECTATOR) کے صفحات میں اسٹیل (STEELE) اور ایڈیسن (ADDISON) برسوں متواتر اپنے مضامین شائع کرتے رہے ان ہی کی تقلید میں چند اور رسالے جاری ہوئے جن کی ہرول عزیز اور مقبولیت کا راز

یہی تھا کہ انہوں نے بعض بہترین انشائیہ نگاروں کو جنم دیا۔ گولڈ اسمتھ (GOLD SMITH) اور چیسٹر فیلڈ (CHETER FIELD) جیسے اساطین ادب انگریزی ان ہی موقت البشروع رسالوں کے ذریعہ ہلکے سے روشناس ہوئے۔ اور پھر نہ صرف انگلستان بلکہ ہر ملک کے انگریزی دان طبقوں پر اپنی قابلیت، زباں وائی اور فصاحت و بلاغت کا سکہ بٹھا دیا بلکہ ان کے مضامین آج بھی انگریزی زبان کے بے نظیر ادب پارے شمار ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی میں چارلس لیمپ (CHARLES LAMB) نے انشائیہ نگاری کا ایک نیا ہیچ اختیار کیا۔ اس کے انشائیوں میں تخیل، محاکات، وجدان اور شخصی تاثرات کا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی صورت اسٹیونسن (STEVENSON) کے انشائیوں کی ہے کہ ان کے زبان و بیان کی جاویدیت اور اظہار مطالب کے اسلوب کا جواب آج بھی نہیں ملتا۔ ایک اور انشائیہ نگار ہیزلٹ (HAZLITT) اس لئے قابل یادگار ہے کہ اس نے اپنے انشائیوں سے ادبی تنقید کا کام لیا۔ انیسویں صدی کے ادیبوں میں میکالے (MACAULAY) کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے، اس نے انشائیہ کے میدان کو بہت وسعت دی۔ اب تک انشائیوں کی امتیازی حیثیت یہ تھی کہ لکھنے والے کے ذاتی مشاہدات و تجربات نیز جذبات زیادہ تر نفسیاتی تقاضوں پر مشتمل ہوا کرتے تھے لیکن میکالے نے انکوفاتیات کی ترجمانی سے بڑی حد تک آزاد کر دیا۔ اس نے تاریخ۔ سیاسیات۔ ادب۔ تنقید غرض ہر چیز کو جو عوامی مفاد سے تعلق رکھتی تھی انشائیہ

میں سمودیا اور اس صنفِ ادب کی افادیت کو ہمہ گیر بنا دیا۔
 ممالک متحدہ امریکہ میں بھی انیسویں صدی عیسوی میں اس صنفِ
 ادب میں نمایاں ترقی ہوئی۔ تھوریلو (THOREAU) اور ایمرسن (EMER-
 SON) نے بڑے معرکہ کے انشاے لکھے ہیں جو تخیل کی بلندی اور حسنِ ادا
 کے بہترین نمونے ہیں



ہماری زبان اُردو کی ابتدا نظم سے ہوئی، اس کی پرورش اور ترقی
 شاعروں اور نوابوں اور درباری امراء کے ایوانوں میں ہوئی، اس ماحول،
 میں صرف قصائد نگاری اور نظم نویسی ہی پروان چڑھ سکتی تھی جس کے ذریعہ
 صاحبان ثروت اور ارباب دولت کی مدح سرائی اور ثنا خوانی کر کے جلبِ
 توجہ کی صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ یا نثر میں داستان سرائی کے ذریعہ
 اپنے مرتبوں اور ممدوحوں کی تعریف طبع اور وقت گزارنے کے سامان مہیا
 کئے جاسکتے تھے اس لئے اُردو نثر کے فروغ اور ترقی کے لئے جن اصنافِ
 ادب پر توجہ کرنے کی ضرورت تھی ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ البتہ
 ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں فورٹ ولیم کالج میں اُردو کے اویسوں اور اہل قلم
 کو انگریزی حکام نے اپنے سیاسی اور سماجی مفاد کے پیش نظر اکٹھا کیا
 اور ان کو ادبی مشاغل پر لگا دیا۔ ان کی کوششوں سے اُردو نثر نگاری کے
 نئے اسلوب پیدا کئے گئے۔ زبان کو مبالغہ، تصنع اور غیر ضروری فارسی کی،
 تقلید نیز تشبیہ و استعارہ کی سحر مار سے پاک کرنے کی ابتدا کی گئی۔ مغربی

آراء و مصنفین کی طرز انشا پر وازی اور نئی فنی سائنسی اور قانونی مصطلحات
و موضوعات سے ہندوستانی اہل قلم کو متعارف کیا گیا۔



اُردو کی اس تہذیب اور تشکیل نو کی مکمل جھلک غالب کی نثر اور
بالخصوص سرسیدؒ کے مضامین میں نظر آتی ہے جو اُردو میں انشائیہ نگاری
کی ابتدائی لیکن کامیاب کوشش کے طور پر ہمیشہ قدر و مقبولیت کی نگاہوں
سے دیکھی جائے گی۔ سرسیدؒ نے اپنی تخلیقات انیسویں صدی کے وسط سے
کچھ پہلے شائع کرانا شروع کی تھیں۔ اس مصلح اعظم اور مسلمانوں کے قومی
نشاطہ ثانیہ کے بانی نے پسماندہ زبان اُردو میں ترقی کی روح پھونکنے اور اس
کو برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے سیاسی و ثقافتی ورثہ کے بار امانت
کو سنبھالنے کے قابل بنانے کے لئے اس کو جملہ صفات ادب سے مالا مال کیا۔
چنانچہ سائنس اور دیگر جدید علوم کو اس زبان سے منتقل کرنے کے علاوہ
انہوں نے انشائیہ نگاری کے بہت اعلیٰ نمونے اس زبان کو دیئے۔ رسالہ
”تہذیب الاخلاق“ میں سرسید اور اُن کے احباب نے مسلسل اعلیٰ
قسم کے مضامین لکھے جو اب بھی اُردو ادب کے شہ پارے سمجھے جاتے ہیں،
سرسیدؒ نے اپنی ذاتی کوشش کے علاوہ اُردو کی خدمت کے لئے علامہ سلیم
پانی پتی جیسے بہترین لکھنے والے بھی اپنے گرد جمع کئے جن کی ادبی کوششوں
نے زبان کو ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ سرسید اور اُن کے رفقاء کے
انشائیوں میں وہ تمام ادبی و فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اس عہد کے

انگریزی اور امریکی اہل قلم کی تخلیقات میں پائی جاتی تھیں اس کے ماسوا، ان کے انشائیوں میں زبان کی سادگی اور شگفتگی، طرز بیان کی صفائی اور بیساختگی نیز مقصد کی وضاحت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا شبلی نے انشائیہ نگاری کو میکالے کی طرح بڑی وسعت دی اور ہر قسم کے مضامین کو ان میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی۔ مہدی الافادی اور سجاد حیدر بیلدرم بھی اردو انشائیہ نگاروں کی فہرست میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس خصوص میں خواجہ حسن نظامی کو بھی ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک صاحب طرز انشاعر پر داز ہونے کے علاوہ صحیح معنی میں مصور فطرت تھے، سر شیخ عبدالقادر۔ قاضی عبدالغفار۔ حکیم احمد شجاع۔ مولانا عبدالمجید سالک۔ میاں عبدالعزیز فلک پیمہ۔ نیاز فتحپوری۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مولانا عبدالمجاہد ریبادی اور پیر علی محمد راشدی نے بھی اردو کے انشائیہ ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔

*
—————

انگریزی اور اردو کے متذکرہ بالا لکھنے والوں ہی کی مسلسل کاوش کی بدولت ثانوی اور اعلیٰ مدارج کے نصاب میں انشائیہ نگاری (ESSAY WRITING) بطور ایک لازمی مضمون ہمیشہ داخل رہا جس کے نتیجے میں ہماری درس گاہوں سے ایک سے ایک اچھے نوجوان لکھنے والوں کی کھپیس کی، کھپیس نکل رہی ہیں۔

*
—————

ان نوجیز زیر تعلیم اور فارغ التحصیل نوجوانوں کے مطالعہ کے لئے ہی جناب فضل احمد صدیقی ایم۔ اے کی یہ کتاب "انشائیے" اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے پیش کی جا رہی ہے۔ صدیقی صاحب ایک پُرانے صحافی اور کہنہ مشق ادیب ہیں انہوں نے شامل کتاب قریب قریب ہر ایک مضمون میں آن آداب کو ملحوظ رکھا ہے جو ایک انشائیہ کے لئے لازم ہیں۔ اپنے نتائج فکر اور مشاہدات کو وہ سیدھی سادی مگر انتہائی شگفتہ زبان میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ قاری بہت کچھ سیکھنے کے باوجود طبیعت پر کوئی بار محسوس نہیں کرتا۔ کسی بھی شخص۔ چیز یا مقام کی تفصیل اس کی جملہ جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو اس کی ایک رنگارنگ تصویر سی کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً بمبئی کے متعلق فرماتے ہیں:-

"اگر آپ بمبئی کے نقشہ پر ایک نگاہ رہانہ ڈالیں،

تو بالکل ایک بادہ کش کے ہات سے چھوٹی ہوئی

بوتل کے مانند پائے گا۔"

بمبئی ہی کے بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

"بمبئی کیا ہے ایک جام جہاں نما ہے جس میں تماشا

گاہِ عالم کے سب کردار۔ سب منظر اور سب

معاٹے دیکھ لیجئے۔"

صدیقی صاحب کے الفاظ میں کراچی کا حال بھی سنئے :-

"اب سے چند سال پہلے اول اول کراچی نظر آیا،

تو بلند یوں میں صرف کوہان اور طوالتوں میں صرف
چند سطرکوں کا جمال دیکھنے میں آیا تھا۔ نیز تجلیوں کی
جستجو میں طوقِ زرّیں اور تجلی گاہوں کے بطور گردن
خر بھی۔ لیکن ترقیوں کی عمر دراز اب کچھ اور ہی نقشہ
نظر آتا ہے۔ طوقِ زرّیں کے قریب پالان بھی ہیں۔
اور گردن خر کی جگہ تازی پشت بھی۔ طوالتوں میں
وہ برکت ہوئی ہے کہ اونٹ کا تو سٹرک پر سے گذرنا
برحق تھا ہی۔ نحو و سٹرک کو بعض اوقات کوہانوں پر
سے گذرنا پڑتا ہے، یعنی کسی نہ کسی مشاق ساربان
کے ناقے کا بے فہار ہو جانا یا بیچ چورا ہے کسی کروٹ
بیٹھ جانا معمولی بات ہے۔ تاہم وقت کا ٹریفک روکے
نہیں رکھا۔ روکے کون جب بھی رفتار کے متوالے
ہیں۔

”بھکاری“ کے باب میں کیا خوب لکھا ہے :-

”بھکاری کیا ہیں، ہر فن مولا، شعر گھڑنے پر آئیں تو
انگلستان کے گولڈ اسمتھ سے لیکر ہمارے یہاں کے
تیر۔ غالب و اقبال تک سب کا قافیہ تنگ کریں،
گلے بازی کریں تو بڑے سے بڑے شاعر شہاب
کا گلا بول جائے۔ تانین لینا اور ماگنیاں الاپنا

شروع کریں تو اچھے سے اچھے تانا شاہ پر غشی طاری

ہو جائے

الغرض آئندہ اوراق میں آپ کو اسی قسم کی طرف نگاری کے نمونے
کثرت اور بہتات کے ساتھ بھرے ہوئے ملیں گے اور آپ یہ کہنے پر مجبور
ہوں گے کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست



حصہ دوم

مقالہ

سرگزشت محمد علی خاں بریلوی عرف جی گرین | ۱۸۵۶ء کے افسانہ نگار

واقعات اور پُراثر روایتیں اکثر انگریزوں نے یادداشتوں اور سرگزشتوں کے نام سے چھاپی ہیں چنانچہ ایک انگریز فوجی افسر فورٹن پھل نے بھی جوکانپور اور بکنو دونوں جگہ کے معرکوں میں شریک تھا اپنے روزنامچے سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی تھی۔ یہ کتاب مسیئر میکملن اینڈ کو کے یہاں چھپی تھی اور اُس کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ جو محمد علی خاں عرف جی گرین کے حالات پر مشتمل ہی منشی محمد شفیع الدین خاں مراد آبادی نے جولائی ۱۸۹۶ء میں شائع کیا تھا۔

اصل انگریزی کتاب اور یہ ترجمہ اب قریب قریب ناپید سا ہے لیکن ہمارے معزز دوست مفتی محمد انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی نے جو کیا چیزوں کی فراہمی میں مہارت رکھتے ہیں انراہ "مصنف" نوازی یہ تحفہ ہمیں مرحمت فرمایا جس کو اس خیال سے کہ یہ اوراق نادرہ محفوظ ہو جائیں مصنف میں شائع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ بھی "تاریخی نوادر" کی اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔ (مصنف علیگڑھ۔ فروری ۱۹۳۶ء)

مولوی عبدالحق صاحب آروادب کے بہترین نقاد ہیں، اس لئے خود بھی بڑی محنت و جانکاهی

اور پوری احتیاط کے ساتھ بے عیب آروادب لکھتے ہیں، موصوف ایک اچوتے طرز نگاہش کے موجد ہیں۔ جس میں شیرینی۔ سلاست۔ روانی بے لطف زبان اور بیساختگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

بعض اوقات غیر مانوس اور وحشی الفاظ و تراکیب سے ایسا کام لے لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور پھر جو چیز مولوی صاحب کے قلم سے ایک دفعہ نکل جائے ناممکن ہے کہ دنیائے ادب میں ہمیشہ کے لئے سداً اعتبار حاصل نہ کرے۔

مولوی عبدالحق صاحب کی تحریر میں جوش و ولولہ اور سوز و گداز بھی بدرجہ اتم ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اردو نظم میں جو درجہ میر انیس کا ہے اردو نثر میں اسی مرتبہ پر مولوی صاحب فائز ہیں۔

ذیل کا مضمون جو مولوی صاحب نے مرحوم راس مسعود صاحب پر اپنے قلب کے انتہائی گہرے اور سچے تاثرات سے رسالہ اردو کے "مسعود فیروز" بابتہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں سپرد قلم فرمایا تھا۔ راقم السطور کی ناچیز رائے میں ان کی طرز انشاء اور اسلوب نگارش کا بہترین نمونہ ہے۔ موضوع بھی ہر لحاظ سے قابل احترام ہے۔ ایسا جامع اور دروانگیر "مشورہ مرثیہ" شاید ہی کبھی کسی نے کسی کے لئے لکھا ہو۔ مثلاً مضمون کا آخری فقرہ۔

"پنچھی اڑ گیا پر ڈالی ابھی تک جھول رہی ہے!"

سبحان اللہ کیا جادو نگاری ہے۔ (مصنف علی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۳۳ء)

(کل ہند) انجمن ترقی اردو کا تقسیم ملک کے بعد جب چراغ گل ہونے لگا تو انجمن کا بہت کچھ پچاس سالہ سامان و فرساد

خطوط

بنام ڈاکٹر مولوی عبدالحق

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا کافی ذاتی سرمایہ علم و ادب بھی دست بردار گیا۔

کاشکار ہو گیا۔ یہ دروانگیز داستان بہت طویل ہے، بہر حال کسی نہ کسی طرح انجمن علی گڑھ میں منتقل ہوئی۔ اور راقم کی دیرینہ خواہش اور کوشش سے آل اٹھیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر کی عمارت سلطان جہاں منزل اس کا مستقر قرار پائی۔ ہزار ہا مطبوعہ اور قلمی کتابوں، سیکڑوں جسطوں اور فائلوں نیز متفرق کاغذات کا ایک انبار بارہ رُکوں میں آیا۔ ساکھڑا ٹیوڈ بڑی بیدروی سے عمارت کے پاس سڑک اور برآمدے کی سیڑھیوں پر ان سب چیزوں کو پھینک کر چلے گئے۔ جناب قاضی عبدالغفار صاحب جدید ناظم انجمن اور ان کے رفقاء کئی ماہ کی محنت شاقہ کے بعد کتب خانہ اور دفتر کو ترتیب دے سکے۔ صبح سے شام تک کاغذات چھانٹے جاتے اور رات کو رڈی کا ڈھیر زندہ آتش کیا جاتا۔ یہ عمل ہفتوں جاری رہا ہے۔ جلنے والی رڈی میں سے جب میرا ادھر کو گذر ہوتا تو جو چیز میرے مطلب کی ہوتی مجھے مرحمت ہو جاتی۔ میری یہ فتوحات ۳۶ خطوط پر مشتمل ہیں جو مشاہیر ملک اور نامور اہل علم و ادب نے جناب مولوی صاحب کو ذمہ نوا تخریر فرمائے تھے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر (۱۲) ڈاکٹر برکت علی قریشی (۳) ڈاکٹر
 خلیفہ عبدالحکیم (۱) مرستید راس مسعود (۱) حافظ محمود شیرانی (۱) ستید
 افتخار عالم بہروی (۲) ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری (۱) صفد مرزا پوری (۱)
 مرزا فرحت اللہ بیگ (۱) ریاض خیر آبادی (۱) علامہ سلیم پانی پتی (۱) ڈاکٹر
 مختار احمد انصاری (۱) مرستید علی امام (۱) مولانا عبدالمجاہد دریا بادی (۳)

نواب عماد الملک سید حسن بلگرامی (۱)، مولوی عبدالعزیز فلک پیادا،
سرتیج بہادر سپرو (۱)، پنڈت سندھ لال (۱)، گاندھی جی (۲)
العلم کی اس اشاعت میں بالفعل ہم نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم
و مغفور کے مکاتیب گرامی شائع کر رہے ہیں۔ اگر مولوی عبدالحق صاحب
قبائلی نے ہماری اس خدمت کو ناپسند نہ فرمایا تو متذکرہ بالا بقیہ خطوط بھی
آئندہ اشاعت میں نذر ناظرین کئے جائیں گے۔

دنیا کے علم و ادب میں ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد
حیدب الرحمن خاں شیروانی کا جو مقام ہے نیز حال ہی میں "غبارِ خاطر" اور
"کاروانِ خیال" سے جو شہرت دوام ان کو حاصل ہوئی اس کی بنا پر ایک
ہی مکتوب الیہ کے نام ان کے بارہ خطوط کا مجموعہ ایک نادر سرمایہ سے کم
نہیں۔ علاوہ بریں مکتوب الیہ بھی ایک معرکہ کی شخصیت ہیں اس لئے قلم کی
شوخی، خیالات کی ندرت اور حسن بیان کی رفعت قابل دید ہے۔ نواب صاحب
اپنی تحریر میں اختصار و ایجاز کے بادشاہ تھے۔ اس خصوصیت کو نگاہ میں
رکھ کر اگر خطوط کو دیکھا گیا تو ان کا لطف و وبال لاہو جائے گا۔

(العلم، کراچی، جولائی ۱۹۵۷ء)

— "العلم" کی گزشتہ اشاعت میں (کل ہند) انجمن ترقی اُردو کے وہلیہ
میں برباد ہونے کے بعد اُس کے اجڑے ہوئے دفتر سے حاصل شدہ
۳۶ خطوط میں سے ہم نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حیدب الرحمن خاں
صاحب شیروانی مرحوم و مغفور کے بارہ خطوط بنام ڈاکٹر مولوی عبدالحق

شائع کر چکے ہیں۔۔۔۔۔ جنکو ناظرین "العلم" نے بہت پسند کیا اور جن کی علمی و ادبی لطافت کی تعریف میں ہمارے پاس کافی اچھی تحریریں موصول ہوئی ہیں۔

مکتوب الیہ جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ نے بھی اُن پر کسی قسم کا اظہارِ نا پسندیدگی نہیں فرمایا۔ اور موصوف کی خاموشی ہمارے لئے نیم رضا کا کام کر گئی۔ اب ہم زیر نظر شمارہ میں خطوط کی دوسری قسط پیش کر رہے ہیں۔

اس دوسری قسط کے سلسلے میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دہلیا باوی کے ایک انتباہ نے البتہ ہمیں بہت کچھ پس و پیش میں لٹائے رکھا۔ لیکن چونکہ ہمارا مقصد علمی و ادبی خدمت ہے اس لئے حضرت موصوف کے مکاتیب بار بار مطالعہ کے بعد بھی ہمیں قابل اشاعت ہی نظر آئے اور بفضلہ اُن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو مکتوب نگاری یا مکتوب الیہ کے وقار کو کسی نوع سے ٹھیس پہلانے والی ہو۔

ہر ایک زبان کے ادب میں مشاہیر کے بیساختہ لکھے ہوئے پبلیٹیٹیٹ خطوط کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور دراصل بلا ارادہ قلم سے نکل جانے والی چیزوں سے ہی کسی فن کار کے کمال فن کا پتہ چلتا ہے مثلاً نواب صدر یار جنگ بہادر جیسے عالم بے بدل اور ادیب شہیر کے اس اعتراف نے کہ

"مقدمہ نگاری کا اگر کچھ سلیقہ ہے تو وہ آپ ہی سے

سیکھا ہوا ہے

»مقدمات عبدالحق« کی قدر و قیمت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور ناممکن ہے کہ ایک یا ایک سے زیادہ بار پڑھ چکنے کے باوجود اس کتاب کو از سر نو نہ پڑھا جائے۔

لیکن پرائیویٹ خطوط کی اشاعت کرنے والے ایڈیٹر کی ذمہ داری بہت سے نازک مرحلوں سے بھی گزرتی ہے اور کوئی شخص ان کو بنے والا چھاپ کر واقعی ملک و ملت یا علم و ادب کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اس حد تک ہمیں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب کی رائے گرامی سے کامل اتفاق ہے۔ (العلم، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۷ء)

مشہور مؤلف جناب مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی آگرہ کے رہنے والے ہیں، ساری عمر

ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا؟
آثار کبر آباد

بادشاہوں کے اسی اُجڑے دیار میں گزری بچہ بچہ سے واقف۔ گلی گلی۔ کوچہ کوچہ سے آشنا۔ خصوصیت سے تاریخی عمارات کے عاشق۔ جب کسی اہل دل ذی علم کو آگرہ جانا ہوتا مفتی صاحب کو تلاش کرتا اور اپنا راہ نمائندہ موصوفی اپنی بیگماتی زبان میں تاریخی حوادث و آثار کو کچھ ایسے تاثر سے بیان کرتے کہ خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے۔ یہ زیادہ رونا بھی بڑا بخش ہوتا ہے۔ آخر کو غریب اللہ یار ہو گئے۔ اور آج ہمارے مفتی صاحب عروس البلاد کراچی کی تعلیم گاہوں۔ کتاب خانوں۔ تاجروں۔ ناشران کتب

اور اہل علم حضرات کے، دانش کدوں، میں بقول حضرت علامہ سید سلیمان
مدنی صاحب ع

من قاش فروش دل صد پارہ خویشم
نظر آتے ہیں۔ زندگی بھر کا شغل تصنیف و تالیف جاری ہے کبھی کبھی ریڈیو
پر بھی سننے میں آتے ہیں لیکن ہر سانس میں ارض تاج اور اس کی انگری صحتوں
کی یاد میں خود بھی ترپتے ہیں اور اپنے نیاز مندوں کو بھی ترپاتے ہیں۔
اس مستقل اذیت روحانی کا ایک ہی علاج سمجھ میں آیا کہ جو کچھ مفتی صاحب
زبانی ارشاد فرماتے ہیں وہ ان سے "العلم" کے واسطے لکھوا لیا جائے۔
چنانچہ جب سے آپ نے ہمیں یہ مضمون عنایت کیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے
گو یا کہ موصوف کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

مفتی انتظام اللہ صاحب کی طرح دوسرے درو مندان ہند سے بھی
التماس ہے کہ وہ اپنے اپنے علم و مشاہدہ کے تاریخی آثار علمی نو اور تعلیمی
یادگاروں کی ایک یادداشت، مرتب فرمائیں۔ تاکہ آئندہ ہماری وہ نسلیں
جنہوں نے پاکستان میں آکر آنکھ کھولی ہے بروقت ضرورت مطلع ہو سکیں
کہ "ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا" (العلم، کراچی، جولائی ۱۹۵۱ء)

ہمارے فاضل دوست جناب مولانا
سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی صاحب

وادی نیل سے وادی نجد تک

مقالہ "انیسویں صدی کا تمدن طلسم ہوشربا کے آئینہ میں" جولائی کے
"العلم" میں شائع ہوا تو ایک معزز ہمعصر نے اس کی تعریف کرتے ہوئے

لکھا کہ یہ "مقالہ کافی محنت سے لکھا گیا ہے" دراصل ایک واقعہ ہوتا ہے اس قدر
تھا کہ یوں ہی چلتے چلا تے بندر روڈ (کراچی) پر ایک روز ہاشمی صاحب سے
ملاقات ہو گئی۔ ہم نے خود مذکورہ عنوان پر ان سے لکھنے کو کہا اور بس
تیسرے ہی روز چالیس ہزار صفحات کی اس عجیب و غریب داستان پر
ایک بھاری بھرم مگر ساتھ ہی انتہا درجے دلچسپ مضمون لکھ کر ہاشمی
صاحب نے ہمارے حوالہ کر دیا۔

مولانا ہاشمی سے دیرینہ نیاز مندی ہے ان کی ذہانت و طباعی، حافظہ
تجربہ علمی اور صحافتی و تجاوتی کارناموں سے ہمیں تفصیلی واقفیت ہے، لیکن اس
قدر زور دینے کا تجربہ نہ تھا۔ چنانچہ ایک معیاری اور دلچسپ مضمون
ایسی آسانی سے ملے ہی ہمارے منہ کو خون لگ گیا اور سہ ماہی "العلم
کے لئے ہر ہفتے ہم نے ان سے بڑے بڑے عجیب اور کتابوں کی کمیابی
کے باعث، مشکل عنوانوں پر مضامین کی فرمائش شروع کر دی اور لطف
کہ کیا مجال جو کثرت کار اور ہجوم افکار کے باوصف ہاشمی صاحب کی خوش
دلی میں ذرا بھی فرق آجائے یا ایک دن کو بھی تعمیل فرمائش ملتوی ہو جائے
ایک مضمون "عہد جاہلیت میں عرب مملکتیں" تیار ہو گیا۔ دوسرا مضمون
"تاریخ داستان گوئی" پر لکھا گیا۔ تیسرا مضمون "دین الہی کے اثبات بالعدل
پر مرتب ہو گیا۔ چوتھا مضمون "علامہ سید سلیمان ندوی کی شاعری" پر مضمون
ہے اور اب یہ دو سو صفحات کا پانچواں مضمون "وادئ نیل سے وادی
نجد تک" ایک علمی سفر ہمارے ہاتھ میں ہے۔ جس کا ایک حصہ بطور

نذر ناظرین کیا جا رہا ہے۔ (العلم کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء)

سندھ کے مشہور صوتی شاعر حضرت
شاہ عبداللطیف کی طرح ریاست

”خواجہ غلام فرید کی شاعری“

بھاولپور اور اس کے تواریح شمالی سندھ اور جنوب مغربی پنجاب میں خواجہ
غلام فرید صاحب کا ملتان کی زبان میں مرتصوفانہ و عارفانہ کلام زبان زد عام
و خاص ہے۔ آپ اس علاقہ کے سب سے زیادہ مقبول شاعر ہیں۔ آپ
کے کلام کو ایک نہایت ہی پراثر سخن کے ساتھ پڑھا اور گایا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ کا شمار بلند پایہ اولیاء اللہ میں بھی ہے چنانچہ آپ کے
سلسلہ کے لاکھوں مرید اور تابع ہیں۔ نواب سر صادق محمد خاں رابع سابق
فرمان رواٹے ریاست بھاولپور بھی آپ سے بیعت تھے۔ اسی شاہانہ
عقیدت کی بناء پر ریاست بھاولپور بھی آپ سے بیعت تھی۔ اسی شاہانہ
عباسی خامس نے خواجہ صاحب کا دیوان مع شرح (اردو) کمالی اہتمام
سے زیور طبع سے آراستہ کرایا ہے۔ یہ شرح و مکتور دیوان مرتبہ دبیر الملک
الحاج محمد عزیز الرحمن صاحب مرحوم ۸۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور پڑھنے
کی چیز ہے۔

زیر نظر مقالہ ہماری خصوصی فرمائش پر جناب صاحبزادہ نور الزماں،
احمد صاحب بی، اے خلف جناب میجر شمس الدین محمد صاحب سابق وزیر تعلیم
بھاولپور نے سپرد قلم فرمایا ہے، جس کی اشاعت سے ہمارا مقصد ہے کہ
غیر ریاستی حلقے بھی کلام خواجہ فرید سے متعارف ہو جائیں۔ صاحبزادہ

صاحب موصوف خود بھی نہایت ذہین و طباع شاعر ہیں اور ساتھ کے ساتھ بہت اچھا ذوق علمی رکھتے ہیں جس کا یہ مقالہ آئینہ دار ہے۔

حضرت خواجہ غلام فرید صاحب راتلہ میں بمقام چاچران پیدا ہوئے اور ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں آپ کا وصال ہوا۔

(العلم کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء)

«العلم» کی سابقہ اشاعت میں ہم نے اپنے فاضل دوست ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب

اسلام کا معاشی نظام

کا خیر مقدم کیا تھا۔ زیر نظر اشاعت میں دلی شادمانی کے ساتھ ہم اپنی علمی برادری کے ایک دوسرے محب خاص جناب ڈاکٹر احسان محمد خاں کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ اور آپ کے افکار عالیہ سے ناظرین العلم کو متعارف کرانے کی مسرت حاصل کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۹ء میں علیگڑھ سے اکتانکس میں ایم اے کیا ۱۹۳۱ء میں لیڈس یونیورسٹی سے اسی مضمون میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا، اس کے بعد آپ ریاست رامپور میں عرصہ تک وزیر مالیات رہے اور اب وہاں سے وظیفہ یاب ہو کر کچھ عرصہ ہوا عروس البلاذ کراچی میں تشریف لے آئے ہیں ڈاکٹر احسان محمد خاں صاحب نے وزارت رامپور کی مصروفیات کے باوصف تصنیف و تالیف کے صالح کام کو ہمیشہ جاری رکھا۔ چنانچہ آپ کی کتابیں (۱) تمدن یورپ (۲) ہندوستان کی اقتصادی تعمیر (دو سالہ) (۳) دنیا کے مسائل اور اسلامی اقتصادیات اور (۴) "ورلڈ پرائیٹ مسلم

اکنائکس « شائع ہو کر کافی مقبول ہو چکی ہیں۔ آخرالذکر کتاب کا دوسرا پاکستانی ایڈیشن زیر طبع ہے اور اسی کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تین اور کتابیں «عورت اور اس کا مرتبہ اور دائرہ عمل» «اسلام کا معاشی نظام» اور مشرقی و مغربی تہذیب» بھی بجد اللہ زیر طبع ہیں۔ (العلم کراچی، جنوری ۱۹۵۶ء)

تعلیم انسانی | تعلیم کا ایک اصول عمل ہے، اس کا یہ مفہوم ہے کہ زندگی کی اصل عمل ہے۔ عمل پر ہی کائنات کی بقا اور نشوونما منحصر ہے، عمل کے بعد علم کا درجہ آتا ہے۔ آج تک یہ ہوا آ رہا تھا کہ پہلے طلباء کو نظری علم دیا جاتا تھا اور اس کے بعد عمل کی طرف متوجہ کیا جاتا تھا۔ یہ چیز غیر فطری تھی اس لئے اس کے نہایت مضر اثرات مرتب ہوئے۔ طلباء باوجود نظری حیثیت سے بہت کچھ جاننے کے بھی کسی کام کو اچھی طرح انجام نہیں دے سکتے تھے، حالانکہ تعلیم کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان زندگی کے عملی مقاصد میں کامیاب ہو، اس اصول کے ذریعہ پہلے طلباء کو کسی کام میں مصروف کرایا جاتا ہے۔ کام کے دوران میں جب اسے مختلف قسم کے علم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تب اسے ان اشیاء کا علم کرایا جاتا ہے پہلے علم کی ضرورت محسوس کرائی جاتی ہے تب کہیں اسے فراہم کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ علم سچا علم ہوتا ہے اور نفس انسانی میں خوب راسخ ہو جاتا ہے طالب علم عمل کے ذریعہ اس قسم کے

۱۹۵۶ء کتاب ۱۹۵۶ء میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے شائع کی ہے۔

حاصل کردہ علم کو کبھی نہیں بھولتا، وہ اس کی زندگی کا ایک جزو بن جاتا ہے اس کے خلاف وہ تمام معلومات جو بغیر کسی ضرورت کے ذہن انسانی میں صرف امتحانات پاس کرنے کے لئے ٹھونس دی جاتی ہیں وہ امتحانات کے ختم ہوتے ہی فوراً غائب ہو جاتی ہیں۔ ان کا زندگی پر کسی قسم کا بھی اثر باقی نہیں رہتا، بلکہ بغیر ضرورت کے اس قسم کی معلومات سے ذہن انسانی پر بوجھ پڑتا ہے، جس سے اس کی فطری صلاحیتوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل جناب ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب کے اس مضمون میں ملاحظہ فرمائیے۔

(العلم کراچی، جنوری ۱۹۵۲ء)

شمس العلماء مولینا حالی

یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو انجمن ترقی اردو کے اردو کالج میں "یوم حالی" منایا گیا جس میں جناب مولوی عبد الحق صاحب نے ایک بہت ہی اچھا مقالہ پڑھا جس وقت ہم اسے سن رہے تھے تو دل میں خیال میں آیا کہ کاش یہ مقالہ "العلم" کے لئے ہمیں مل جاتا لیکن ہر چند غور کیا۔ حسن طلب قسم کا کوئی عنوان سمجھہ میں نہ آیا۔ کیونکہ مولوی صاحب کے خود اپنے رسائل میں "خوشی سے بچے تو درویش" کو طے مگر یہ دنیا مسافر نواز کی طرح "درویش نواز" سے بھی خالی نہیں ہے۔ لہذا ایک دن یہ ہوا کہ ہم یوں ہی توکل بخدا بیٹھے تھے کہ جناب مولوی محمد امین زبیری صاحب دفتر کانفرنس کی طرف آئے، آتے ہی فرمایا۔ "مولانا حالی پر ایک مقالہ لکھا ہے، کیا اسے چھاپو گے؟" معاً زبان سے نکلا سبحان اللہ اب جو زبیری صاحب

کے مقالہ کو پڑھا تو اس کو مولوی صاحب کے مقالہ سے کسی طرح کم درجہ کا نہ پایا۔ کیوں نہ ہو! ہمارے زبیری صاحب نہ صرف مولوی صاحب کے ہم عمر اور ۵۷ سال کے پُرانے رفیق خاص ہیں بلکہ حالی پرستی، میں بھی ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں، علاوہ بریں ان کا مرتبہ تصنیفی و تالیفی باعتبار تعداد کتب و اسالیب زبان و بیان بھی قریب قریب ہم پلہ ہے۔ یہ دونوں حضرات اپنی اپنی علمی کوششوں میں ایک دوسرے کے کافی شریک و سہیم بھی رہے ہیں۔ چنانچہ خطوط شبلی (بنام عطیہ بیگم) کو اگر ایک طرف زبیری صاحب نے ریسرچ کر کے مرتب کیا تو دوسری طرف مولوی عبدالحق صاحب نے ان پر ایک دلیرانہ مقدمہ لکھ کر ان کی شہرت میں اضافہ فرمایا۔ اسی طرح اور بہت سے کام ہیں جن کو یہ دونوں بزرگ مدت العمر ایک ساتھ کرتے رہے ہیں۔

زیر نظر مقالہ بھی اسی قسم کے "توار و خیال" کا نتیجہ ہے۔

ہم محترم زبیری صاحب کے بدل شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنا قیمتی مقالہ "العلم" کو مرحمت فرمایا اور جناب مولوی صاحب کو تکلیف دینے کی زحمت سے ہمیں بچا لیا۔ (العلم کراچی۔ اپریل ۱۹۷۷ء)

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی

کی تاریخ برصغیر پاک و ہند ہمارا

۱۸۱۵ء کا ایک سفر بنگال

خاص مضمون ہے۔ اس لئے ملک کے اس عبوری دور کی جو بھی نادر کتاب ہماری نظر سے گزری اس کی نقل یا اردو ترجمہ اپنے پاس محفوظ کرنے کی

کوشش کی گئی۔ انھیں نواد میں نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم و مغفور کے کتاب خانہ جیب گنج سے ترجمہ کرائی ہوئی ایک کتاب «وقائع عبدالقادر خانی» ہمارے پاس ہے جس میں اواخر اٹھارویں و اوائل انیسویں صدی عیسوی کے چشم دید اور آپ بیتی حالات درج ہیں۔ مصنف کتاب کا نام مولوی عبدالقادر برلاس (صدر الصدور مراد آباد ہے) ان کے دادا عالم احمد عہد محمد شاہ، میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے، وہلی کے برلاس خاندان میں شادی ہوئی۔ والد کا نام محمد اکرم اور آشنا تخلص تھا۔ ان کی مراد آباد میں شادی ہوئی۔ وہیں ۱۷۸۱ء میں عبدالقادر پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالقادر نے علمائے مراد آباد، بریلی و رامپور سے تحصیل علم کیا۔ اور فقہ، حدیث، تفسیر ہیئت، ہندسہ، حساب اور فرائض میں مہارت تامہ حاصل کی۔ اس وقت ادوہ میں آصف الدولہ کے بعد نواب سعادت علی خاں حکمراں تھے اور روہیلکھنڈ میں احمد علی خاں نواب رامپور تھے۔ ابتداً ریاست رامپور میں اور اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو گئے۔ یہ سلسلہ ملازمت ہی بانس بریلی (یو، پی) سے ڈھاکہ تک کشتی میں دریائی سفر کیا۔ بعد ازاں وہلی اور راجپوتانہ میں ملازمت کا کافی عرصہ گزرا۔ خاصی طویل عمر پائی اور جہاں جہاں رہے وہاں کے سیاسی۔ تمدنی اور معاشرتی حالات قلمبند کرتے رہے۔ ہم عصر علماء، شعراء اور دوسرے صاحبان فضل و کمال سے ملنے کا خصوصی شوق تھا اس لئے جس جس سے ملے اس کا حال لکھا۔

چونکہ مسلمانوں کے عہد زوال یعنی انگریزی دور حکومت کی تاریخ بہت

کچھ پردہ خفا میں ہے اس لئے اس کتاب سے صدہا عجیب و غریب واقعات اور بہ تعداد کثیر اہل کمال کے کمالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ہمارا قلمی مسودہ کتاب بڑی تقطیع کے تقریباً پانچ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور پھر بھی کتاب نامکمل ہے، اصل فارسی نسخہ بھی نامکمل ہی تھا۔ ممکن ہے اصل کتاب جنگ آزادی یا اس کے قریب زمانہ تک ہی ہو۔ بہر حال ذیل کا تراشہ ۱۸۱۵ء کے سفر مشرقی بنگال سے متعلق ہے جس سے آج کل ہم پاکستانیوں کو سب سے زیادہ دل چسپی ہے (العلم کراچی، جنوری ۱۹۵۳ء)

ہماری تعلیم اور اس کی روح | سید ابو عاصم ایم، اے ایڈووکیٹ
کا یہ مقالہ آل پاکستان ایجوکیشنل

کانفرنس کے اجلاس سالانہ کے موقع پر ۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ادارہ تصنیف و تالیف کے جلسہ میں زیر صدارت حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب پڑھا گیا تھا۔ فاضل مقالہ نگار حضرت علامہ کے خویش ہیں۔ تعلیم جدید اور ماحول دینی کے امتزاج کی وجہ سے آپ کے طرز فکر اور اسلوب نگارش میں ایک دل آویز نمدت پائی جاتی ہے۔ آپ کے مقالہ کو جوں جوں پڑھتے جائیں اس کی دل چسپی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ خاص چیز یہ ہے کہ جو بات کہنی ہوتی ہے اس کے لئے پہلے ذہن و دماغ میں حسن قبول کی فضا پیدا کرتے ہیں اس کے بعد ایک طرح کا ایسا سرسری انداز اختیار کرتے ہیں کہ گویا یوں ہی بات میں بات آئی ہے۔

ایسے اچھے ادیب اتفاقاً ہی بات بات لگتے ہیں، چنانچہ عاصم صاحب کی یہ

پہلی تحریر ہے جو ہمارے مطالعہ میں آئی اور غالباً ناظرین العلم بھی پہلی ہی بار ان سے متعارف ہوں گے۔ آپ کو ڈھونڈ نکالنے اور اپنے شعبہ کے لئے یہ مقالہ لکھوانے کا اصلی کریڈٹ ہمارے "جہاں گشت" دوست مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی کو ہے جن کی بابت محترم رشید احمد صدیقی صاحب پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ "وہ کسی دھواں دھارہ جوالا لکھی میں جا رہے ہیں تو وہاں سے بھی کوئی نہ کوئی پُرانا قلمی نسخہ نکال لائیں گے"

شہابی صاحب گئے تو تھے حضرت علامہ کی صدارت منظور کرانے اور پکڑ لائے وہاں سے عاصم صاحب کو بھی جنہیں ایک ادیب و مضمون نگار کی حیثیت سے ہم میں سے کوئی نہ جانتا تھا۔ اسی لئے عاصم صاحب کا یہ مقالہ (جو بہت بدخط بھی لکھا ہوا تھا) ہمارے پاس چھ مہینے تک کسمپرسی کے عالم میں پڑا رہا۔ لیکن آج جب اسے دیکھا تو اس سے آنکھیں روشن ہو گئیں۔

ہم نے اس تعارف میں عاصم صاحب کے تحریر کردہ مباحث کو بالکل بات نہیں لگایا ہے کیونکہ اس سے اس کے "دست و بازو" کو نظر لگ جانے کا احتمال تھا۔ بالخصوص مقالہ کا آخری حصہ بہت کچھ تشریح و تفصیل کا محتاج ہے

(العلم کراچی، اپریل ۱۹۵۳ء)

۱۸۵۶ء کے بعد مسلمانان برصغیر پاک و ہند

تثقید حیات جاوید کی تاریخ دراصل علیگڑھ کی تاریخ ہے جس کو

مشاہیر اہل قلم نے دو مختلف زاویے سے لکھا ہے۔ ایک زاویہ نظر یہ ہے کہ اگر سرسید کی علیگڑھ تحریک نہ ہوتی تو مسلمان قوم اچھوتوں سے

بدتر و درجہ پر پہنچ جاتی اور بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں جس قدر سیاسی، معاشی، عمرانی، ثقافتی، تعلیمی اور علمی ترقی مسلمانوں کی ہوئی وہ تمامتر علیگڑھ کی وجہ سے ہوئی۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ علیگڑھ نے انگریز پرستی کی تعلیم دی اور تقریباً پون صدی تک برصغیر پاک و ہند نیز ممالک مشرقی پر انگریزوں کے ظالمانہ اقتدار کی جڑیں علیگڑھ والوں نے مضبوط کیں۔

اول الذکر مکتبہ خیال کے بڑے منادوں میں مولوی محمد امین زبیری صاحب کا بھی شمار ہے۔ جو گزشتہ پچاس سال سے مسلسل علیگڑھ و اکابرین علیگڑھ کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔ ڈیڑھ درجن کے قریب آپ کی تصانیف ہیں، مضامین و مقالات کا تو شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ ذیل کا مقالہ بھی مولوی صاحب کے سچتہ کار قلم کار میں منت ہے۔ جس میں موصوف نے بعض ایسے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ جو اب تک عام مطالعہ میں نہ تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ حقائق نگاری کی کوشش میں مولوی محمد امین زبیری صاحب نے اس وفد والہانہ عقیدت کی عینک اتا کر مرستید علیہ الرحمۃ اور شمس العنماء مولانا حالی نور اللہ مرقدہ کی کچھ بے لاگ تنقید بھی کی ہے۔ مولوی محمد امین زبیری صاحب۔ مولوی عبدالحق صاحب کی طرح چونکہ ہمیشہ سے ”حالی اسکول“ کے آدمی ہیں اور حضرت علامہ شبلی کے نقاد۔ لہذا مولانا حالی کی شاہکار تالیف حیات جاوید، پران کی یہ تنقید ادبی دنیا میں ایک انقلابی واقعہ متصور ہوگی۔ دیکھنا ہے کہ مخدومی جناب

مولوی عبدالحق صاحب اور مکرمی شیخ محمد اکرام صاحب کا اس پر کیا رد عمل ہوتا ہے۔ جہاں تک ہماری رائے کا تعلق ہے ہم ہر دو مکاتیب خیال کے بزرگوں کے خادم اور مداح رہے ہیں۔

(العلم کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء)

آزادی اور اس کی نعمتوں

سے قطع نظر، جن کا اقرار

ہم میں سے ہر شخص کا ایمان

ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا؟
روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات

ہے، اس وقت پاکستان میں دو خیال کے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو یہاں آکر پہلے سے بدرجہا بہتر حالت میں ہیں اور اس لئے ہندوستان کی سابقہ زندگی کو ایک خواب پریشاں سے تعبیر کرتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو پہلے سب کچھ تھے اور اب کچھ نہیں ہیں۔ لہذا ان کے دل و دماغ سے "ہندوستان جنت نشان" کبھی محو نہیں ہوتا۔ وہی لوگ وہاں کے عہد اسلامی کی تاریخی عظمت رفتہ اور ثقافتی عروج و زوال کو بھی یاد کرتے ہیں۔ آخر الذکر اصحاب پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے والوں کی، طرح چاہے قدامت پسند ہی کیوں نہ کہلائیں۔ لیکن کم از کم ان کے پیش نظر ایک بلند قومی نصب العین ضرور ہے، اسی نصب العین کے محرکات میں سے ایک چیز یہ ہے کہ آئیوالی نسلوں کے لئے کچھ یادگار چیزیں داشتہ آید بکار کے اصول پر لکھ کر محفوظ کر دی جائیں چنانچہ "ہندوستان میں ہم نے کیا چھوڑا؟" کے زیر عنوان ایک مقالہ العلم کے پہلے شمارہ

بابہ جولائی ۱۹۵۷ء میں مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کا لکھا ہوا،
 "اتحاد اکبر آباد" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اب عمارات روہیل کھنڈ کے
 بارے میں یہ دوسرا مقالہ ہے جو دو قسطوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ لائق
 مقالہ نگار محمد ایوب قادری صاحب نے اپنے مضمون کی تیاری میں جیسی
 محنت شاقہ کی ہے اس کی داد تمام وہ حضرات دیں گے جن کو کبھی اس قسم کی
 تحقیقی چیز لکھنے یا مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔

شک آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید

(العلم کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء)

عہد اسلامی میں علمی اور تہذیبی ترقی | پاکستان بننے کے کئی سال
 بعد تک ہمارے اسکولوں

اور کالجوں میں تاریخ کی پُرانی کتابیں ہی پڑھائی جاتی رہیں۔ ایک ایسی
 تاریخ جو مخصوص پاکستان کے جغرافیائی حدود اور وجود پر بھی روشنی
 ڈالتی ہو جو وجود نہ تھی۔ ہمارے مخدوم مولانا سید ہاشمی فرید آبادی نے
 اس کمی کو پورا کیا۔ اور "مسلمانانِ پاکستان و بھارت کی تاریخ" کو اس
 طور پر ترتیب دیا کہ پاکستان کی تاریخ بھی صاف طور پر علیحدہ نظر آنے
 لگی۔ واقعات سب پرانے ہیں۔ صرف ترتیب میں مفید چابک دستی سے
 کام لیا گیا ہے۔

ہاشمی صاحب نے دوسرا اچھا کام یہ کیا کہ اپنی کتاب کو محض جنگی
 وقائع اور بادشاہوں کے رزمیہ کارناموں تک محدود نہ رکھا بلکہ خاتمہ

ابواب میں عہد بے عہد کی علمی اور تہذیبی ترقیوں کو بھی موثر انداز میں جاگرتے چلے گئے جس کا مطالعہ تاریخ کے طالب علموں۔ پاکستانی قوم اور اس کے حاکموں کے لئے از بس ضروری تھا۔

چونکہ فی الوقت پاکستان میں علمی وثقافتی سرگرمیاں اور ان کی خاطر خواہ قدر دانی نظر انداز ہے اور صاحبان علم و فن کا ستارہ گردش میں ہے لہذا محض اس بات کو یاد رکھنے اور یاد دلانے کے لئے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ اور ہر حال میں حکمرانی اور معارف پروری کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

.. ہم ہاشمی صاحب کی تاریخ کو پڑھتے وقت ان حصوں پر نشان کرتے گئے جو ثقافتی جدوجہد سے متعلق تھے۔ ان نشان زدہ حصوں کا جب ہم نے یکجائی مطالعہ کیا تو عہد اسلامی کی علمی ترقیوں کی ایک مکمل تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ اپنی اس پسندیدہ تصویر کو ہم بجنسہ ناظرین "العلم" کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں تاکہ ماضی کی اس شاندار یادگار کو حال و مستقبل کے لئے نشانِ راہ بنایا جاسکے۔

متفرق مضامین کو مربوط کرنے کے لئے ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں اور چند سطروں کا بخطِ خفی اضافہ کیا گیا ہے۔ دو مقام محل نظر تھے انکو حوالوں کے ساتھ حل کر دیا ہے۔

الغرض ہاشمی صاحب کی تھوک کی کوٹھی سے خوردہ کی یہ دوکان سج گئی ہے کاش اسے خریدار بھی پسند کریں۔
 العلم کراچی جنوری ۱۹۵۲ء

انسان کی کہانی سرسید، حالی، ندیم احمد اور اسماعیل میرٹھی نے اردو ادب میں "اے سے رائٹنگ" کی بنیاد ڈالی جس کو ہم تخلیقی ادب کہہ سکتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی اس صنفِ ادب کو چار چاند لگائے لیکن ادھر کافی عرصہ سے ہمارے لکھنے والوں کا اور ڈھنا بچھونا تلخیص و تالیف اور تراجم ہو کر رہ گیا ہے۔ زیادہ احتیاط، برقی تو دور دراز کی زبانوں میں شائع شدہ چیزوں سے اپنی دوکان بھالی اور بدلیسی چیز پر ویسی کا مٹھہ لگا لیا جس کی اصل حقیقت کا مدتوں پتہ نہیں چلتا۔ لکھنے والوں کی اسی تہی و امنی اور سرقہ بازی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ملک میں متقدمین تو متقدمین متاخرین تک کی سی شہرت رکھنے والے ادیب اور شاعر دستیاب نہیں ہوتے۔ ویسے "تیار مال پریا حسین" کہنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

جناب ایس۔ ایم ضیا صاحب کا یہ مضمون اگرچہ معیاری نہیں ہے اور اس کی زبان قابل مطالعہ بنانے میں ہمیں کاوش کرنی پڑی لیکن پھر بھی چونکہ اس میں تخلیقی ادب کی ایک جھلک پاٹی جاتی ہے اس لئے ہم اسے قدر کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (العلم کراچی۔ ستمبر ۱۹۵۳ء)

مسٹر اے ایس ٹرنٹن پروفیسر عربی لندن یونیورسٹی کا

مسلمانوں کی تعلیم قرون وسطیٰ میں

ایک معلومات افزا مضمون بعنوان "مسلم ایجوکیشن ان ڈل ایجیز" رسالہ مسلم ورلڈ میں شائع ہوا ہے۔ اسکی قابل قدر تلخیص "مسلمانوں کی تعلیم قرون

وسطی کے نام سے جناب نذیر حسین صاحب ایم اے لاہور نے کی ہے مسٹر
ٹرن مستشرق ہیں اور راقم کے زمانہ طالب علمی میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
عربک ڈپارٹمنٹ کے چیرمین بھی رہ چکے ہیں۔

(العلم کراچی، جنوری ۱۹۵۴ء)

دو سو سال کی غیر ملکی غلامی کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند
میں صحافت کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ کیونکہ

غم ترک وطن

انتہائی احتیاط کے باوجود ایڈیٹر اخبار کا ایک پیرکریسی ادارت پر ہوتا تھا تو
دوسرا جیل میں ایک مقررہ ڈگری تھی جس پر ہر صحافی کو چلنا پڑتا تھا۔ آزاد
اخبار نویسوں کا کام آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا چنانچہ مولانا ظفر علی خاں
مولانا محمد علی اور مولانا آزاد وغیرہم چند انگلیوں پر گنے جانے کے لائق شہر
ایڈیٹروں کے ماسوا اس ضروری اور شریف پیشہ کے باقی تمام لوگ عرف عام
میں سرکار پرستی یا

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

کی پالیسی پر عمل کر کے صبر آزما استقامت کے ساتھ اپنے اپنے اخبارات کو جو
زیادہ تر ہفتہ وار ہوتے تھے جوں توں زندہ رکھتے تھے۔ "پیسہ اخبار" لاہور
"اہلحدیث امرتسر"، "مشرق گورکھپور"، "عزیز ہند جھانسی۔
"سرگزشت" علیگڑھ۔ "نیراعظم" و "مغرب عالم مراد آباد" روہیل کھنڈ گڑھ
و "روزانہ اخبار" بریلی، "میزان" یا "المیزان" شاہجہانپور و "دبیر سکندری"
رامپور، ذوالقرنین "اول العدل بدایوں وغیرہ وغیرہ اسی قسم کے اخبارات تھے

جنہوں نے اپنی محتاط روشن کی بنام پر بڑی بڑی عمریں پائیں حتیٰ کہ بعض کو جاری ہوئے پچاس پچاس سال گذر گئے۔

یہ اخبارات اور ان کے مالک و مدیر، اس ایک چیز کو چھوڑ کر کہ وہ حاکم وقت کے ہر حال میں وفادار تھے۔ مذہبی، ثقافتی، اصلاحی، تعلیمی اور علمی و ادبی باقی امور میں بڑے کٹر مسلمان ہوتے تھے اور اپنے مسلمان، جماعتوں کی ہمدردی و اعانت میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اس خصوص میں ان کے بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے یہ حضرات اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں کافی وسیع شخصیتوں کے مالک تھے۔

ہمارے انہیں موقر بزرگوں میں سے ایک بزرگ جناب خانصاحب محمد لطافت حسین صاحب دل ہاشمی ایڈیٹر "العدل" بدایوں ہیں، آپ نہایت مستقل مزاج پختہ وضع کے بزرگ ہیں ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک کے بعد بدایوں میں خصوصیت سے بلوے ہوئے، مسلمان مارے گئے تباہ و برباد ہو کر ہجرت پر مجبور ہوئے۔ آپ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں دیکھتے رہے اور اس محلہ میں جہاں آپ کے معمر اور ضعیف چچا اور آپ کے سوا کوئی باقی نہیں تھا سب مکانون پر ہندو شرنارتھیوں کا قبضہ ہو چکا تھا (کیونکہ آپ کے سب عزیز ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے تھے)۔ آپ باوجود جسمانی کمزوری کے دلیری کے ساتھ ڈٹے رہے جون ۱۹۵۷ء میں جبکہ آپ کے ایک عزیز اور مخصوص دوست مع دو جوان بیٹوں کے ایک دوسرے قریب کے محلہ میں شہید کر دیئے گئے تو آپ کا پیمانہ ضبط و تحمل لبریز ہوجانا

لازمات اور بددیہات سے تھا۔ آپ نے اپنے بڑے صاحبزادے محمد نیرالاسلام ہاشمی بی، اے سے جو عرصہ سات سال سے محکمہ سیلابی میں ملازم تھے اور رامپور میں چیف انسپکٹری سے گزٹ میڈ عہدہ کے واسطے نام کیا ہوا تھا نتیجہ کا انتظار کئے بغیر ملازمت ترک کرائی "ہاشمی پریس" اخبار "العدل" "ہاشمی بکڈ لو" مکان اور جائیداد سب کو خیر باد کہہ کر اپنے وطن بدایوں میں با چشم گریاں کراچی کا رخ کیا۔ اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو اپنے بچوں کو ہمراہ لیکر دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچ گئے۔ اب آپ کا کام خدا کی یاد اور دوستوں اور عزیزوں کی دعا گوئی کے سوا کچھ نہیں۔ کبھی موقع ملا تو، مخصوص دوستوں اور عزیزوں سے مل لے۔ ہاشمی صاحب کو راقم سے بھی خلوص ہے کبھی کبھی کرم فرماتے ہیں اور مطابقت اور ملفوظات سے سرفراز فرماتے ہیں۔ نظم "غم ترک وطن" بھی آپ نے ایک روز ہمیں سنائی تو ہم نے اس کو حد درجہ پڑا پڑا اور پسند کیا اور "العلم" کے لئے حاصل کر لیا۔ نظم مذکورہ اصل پاکستان میں آئے ہوئے ہر ایک تارک وطن کے دلی جذبات کی آئینہ دار ہے، جو محسوسات و واردات قلبی ہاشمی صاحب کے ہیں وہ ہم میں سے ہر ایک کے دل میں اپنے اپنے وطن عزیزوں اور دوستوں کے بارے میں موجزن ہیں۔ ایک اور خوبی اس نظم کی یہ ہے کہ بدایوں جیسے تاریخی اور مردم خیز شہر کے بکثرت صاحبان فن و کمال کے نام اور کام "نوشتہ بماند سیاہ بر سپید" کے مصداق اس میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔

(العلم کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء)

مندرجہ بالا فاضلانہ اور محققانہ
مقالہ ہمارے عزیز و محترم
دوست قاری بشیر الدین،

برصغیر پاک و ہند میں آیاتِ حرب کی ایجاد و ترقی

پنڈت ایم، اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)، وائس پرنسپل اسلامیہ کالج شاہجہانپور
یو، پی۔ بھارت نے ۱۶ فروری ۱۹۵۷ء کو خیر پور ہسٹاریکل کانفرنس میں
پڑھا تھا اور اہل نظر لوگوں سے داد و تحسین حاصل کی تھی لیکن افسوس
ہے کہ ۸ اپریل ۱۹۵۷ء کے "صدقِ جدید" لکھنؤ میں "شریک بزم" کے
نام سے ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ مقالہ پر تھوڑی راج راسا، از چاند بروالی
پر حافظ محمود شیرانی مرحوم کی مشہور و مقبول تنقیدی کتاب کا ایک نقل
شدہ نا تمام حصہ ہے۔ ہماری رائے میں یہ اعتراض غلط ہے اور معتزوں
صاحب نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ محمود شیرانی صاحب کی کتاب کو
پڑھے بغیر ہی اعتراض برائے اعتراض کر دیا ہے، ساتھ ہی پنڈت بشیر الدین
صاحب کے مقالہ کی قدر و قیمت کا بھی غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے صحیح اندازہ
نہ کیا۔ کانفرنسوں کے مواقع پر وقت کی قلت اور مقالوں کی زیادتی کے
باعث کوئی شخص اپنا پورا مضمون نہیں پڑھ پاتا۔ حواشی اور ذیلی حوالجات
کو پڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ جب مقالہ اپنے پورے لوازمات
کے ساتھ شائع ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ جو شخص موانعاتِ جلسہ کے باعث
اپنا رنگ نہ جاسکا اس نے دراصل کس پایہ کی چیز پیش کی تھی اور جو شخص
ظاہری ٹھاٹ اور زور بیان سے مجمع پر چھا گیا تھا اس پر کیونکر کوہ گندنہ

کاہ بر آوردن کی مثل صادق آتی ہے۔

ہمارے دوست پنڈت بشیر الدین جو پشیمینی مسلمان ہونے کے باوجود نو مسلموں کی سی گنگا جمنی طول طویل وارطھی رکھتے ہیں، پستہ قد اور سیاہ فام ہیں نیز لباس و معاشرت میں رجعت پسند ہیں، ناواقف لوگوں کی غلط فہمی کا اکثر شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اور جب بھی وہ کوئی ادنیٰ چیز لکھتے یا پڑھتے ہیں تو واقعی یہ خیال ہوتا ہے کہ ”یہ منہ اور مسور کی دال“ لہذا ان کے ناقد ”شریک بزم“ کے دل پر بھی یقیناً کچھ اسی قسم کا اثر ہوا ہوگا جو انہوں نے ان پر اعتراض کر دیا۔ لیکن ہم ان سے عرض کریں گے کہ

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
توجہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

(العلم کراچی، جنوری ۱۹۵۵ء)

رابرٹ اسٹیونسن

(۱۸۵۰ — ۱۸۹۳)

انیسویں صدی کا ایک شہور

مختم

(ایک گنگھگار کے نفسیات کا مطالعہ)

انگلستانی ادیب اور ناول نگار ہے۔ جو مغربی ادب میں مخصوص حیثیت کا مالک ہے۔ اس کہانی میں اُس نے قاتل کی ذہنی کش مکش کا مرقع پیش کیا ہے اس تصنیف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ فنکار کو منزل مقصود کا پورا علم و عرفان ہے اور وہ جھٹکے جھٹکائے بغیر سیدھا وہیں جا پہنچتا ہے، یہ نگارش بڑا کمال

ہے۔ کہانی سادہ ہے مگر سطحی نہیں، گہری ہے مگر چھپیدگی سے بری ہے مفصل ہے مگر غیر متعلق سے پاک ہے۔ مزید برآں وحدتِ تاثر سے اس حد تک لبریز و مرشار ہے کہ یونانی ڈرامے کے رنگ میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس شہ پارہٴ ادب میں حیاتِ جاوید کے سارے اجزاء موجود ہیں۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ شکسپیئر کے عہد میں سوائے خود اس کے کسی صاحبِ فضیلت سے یہ کہانی لکھنا ممکن نہ تھا، مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفسِ کروار کا جیسا تجزیہ اس کہانی میں کیا گیا ہے وہ صرف شکسپیئر جیسے نباضِ فطرت اور حکیمِ نفس سے ہی ممکن تھا۔ جناب مخمور اکبر آبادی نے "مارخیم" کی اس کہانی کا ترجمہ کر کے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ توقع ہے کہ جناب موصوف مصنفِ علام کے کچھ اور ادبی شہ پارے بھی ہمیں عنایت فرمائیں گے۔

(العلم کراچی جولائی ۱۹۵۵ء)

جب سے پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے "اسلام زبانِ نادر" اس بنا پر کہ وہ ایک اسلامی ملک ہے۔

عربی کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں عربی زبان کو نصابِ تعلیم میں لازمی مضمون بنانے پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔ اس تحریک کے پرجوش حامی ہمارے بزرگ جناب مولوی سید ظفر حسین واسطی صاحب ایم۔ اے ایڈووکیٹ ہیں۔ آپ نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سالانہ سلسلہ بمقام علی گڑھ میں لزومِ عربی پر ایک

زوردار مقالہ پیش فرمایا تھا جس کی کانفرنس کی جانب سے بڑے پیمانے پر اشاعت ہوئی۔ اس کے بعد آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ہائے ۱۹۵۶ء و ۱۹۵۷ء بمقام کراچی میں تجاویز پیش کیں اور انکو بالاتفاق منظور کرایا۔ "العلم" میں بھی آپ کا ایک مقالہ تجاویز مذکور کی تائید میں شائع ہو چکا ہے۔

جناب واسطی صاحب کے علاوہ ہزبائی نیشنل سرآغا خاں صاحب نے بھی کچھ عرصہ ہوا پاکستان میں لسانی اختلافات کو ختم کرنے کے لئے لزوم عربی کی پر زور حمایت کی تھی۔

اسی طرح ہمارے دوست مولوی حسن الاعظمی پرنسپل نیو عربک کالج کراچی پاکستان کی زبان عربی بنانے کے زبردست مناد ہیں چنانچہ ابھی حال میں "العلم" بابت جنوری تا مارچ ۱۹۵۶ء میں ہم ان کا ایک پر از معلومات مضمون شائع کر چکے ہیں۔

لیکن ہمارے ملک میں ایک ذی اثر مکتبہ خیال جس کے سرگروہ حضرت بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب صدر کل پاکستان انجمن ترقی اردو ہیں۔ مذکورہ تحریک عربی کے مخالف ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس سے ملک کی قومی زبان اردو پرکاری ضرب پڑتی ہے۔ اردو کی ذوق ریف زبانیں بنگالی اور انگریزی اس کا دم توڑ دینے کے لئے کیا کم ہیں کہ عربی کو بھی اس کی جان زار پر مسلط کر دیا جائے۔

ہر دو مکاتیب خیال میں سے کون حق پر ہے اس کے لئے ضروری

ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ بغور دیکھے جائیں۔ ملکی و قومی زبان کے مقابلہ میں دوسری زبان بالخصوص عربی کو اختیار کرنے کا مسئلہ کچھ پاکستان کے واسطے ہی مخصوص نہیں ہے۔ ہمارے پڑوسی اسلامی ممالک ایران اور ترکی بھی اس سے دوچار ہو چکے ہیں۔

مندرجہ بالا مقالہ میں ملت ایران کے نقطہ نظر کو نہایت بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ عربی کے مقابلے میں فارسی کی حمایت کرتے ہوئے جہاں جہاں فارسی کا لفظ آیا ہے اُس کی جگہ پر اُردو کا لفظ رکھ دیا جائے تو یہ مقالہ پاکستان میں قومی زبان اُردو کے حامیوں کے خیالات کی بھی پوری پوری ترجمانی کر دیتا ہے۔

اس مقالہ کی ہدات خود بھی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ کیونکہ وہ سب سے پہلے ”جبل المتین“ مکتبہ میں شائع ہوا۔ پھر روزنامہ ”سرفراز“ لاکھنؤ کی اشاعت مورخہ ۱۵ شوال ۱۹۲۵ء میں طبع ہوا۔ بعد ازاں مشہور رسالہ ”سہیل“ علی گڑھ (زیر ادارت پروفیسر رشید احمد صدیقی) کے شمارہ جنوری لغایت مارچ ۱۹۲۶ء میں اشاعت پذیر ہوا اور اب ہم اسی ندرِ ناظرینِ العلم کر رہے ہیں۔ بقول فاضل مدیر ”سہیل“ دیکھنا یہ ہے کہ ارباب ذوق اور صاحبان نظر سخن ہائے گفتنی کے سلسلہ میں کیا کرتے یا کہتے ہیں۔

اس باب میں خود اپنی رائے ہم ایک طرف حضرت بابائے اُردو، مولوی عبدالحق صاحب کے ڈر سے اور دوسری جانب واسطی صاحب

کے خوف سے محفوظ رکھنے پر مجبور ہیں۔

دو گونہ رنج و عذاب است جانِ مجنون را

خیالِ فرقتِ لیلے و صحبتِ لیلے

(العلم کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

مولانا مفتی حافظ بخش صاحب
عزیز گرامی قدر محمد ایوب
قادری صاحب کا یہ

چھٹا مقالہ ہے جو "العلم" میں شائع ہو رہا ہے اس سے قبل روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات پر دو مقالے اور "مجاہد جلیل مفتی محمد عیوض" مولانا علی احمد خاں آسیر" اور "مولانا فیض احمد بڑا یونی" پر ان کے مقالات چھپ کر صاحبانِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ایوب قادری صاحب جس محنت شاقہ سے لکھتے ہیں اور تحقیق و تدقیق کا جو اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں اُس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے تین ہزار کتابوں پر مشتمل ذاتی کتب خانہ کی مدد سے جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں وہ بالکل نیا ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ تاریخ کے قطعی تاریک گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی کا نام اصلی ریسرچ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جب آئندہ اردو یا تاریخ میں ڈاکٹریٹ کے لئے وہ اپنا تحقیقی مقالہ پیش کریں گے تو ملک و ملت کے لئے ضرور کوئی قابل فخر اور یادگار خدمت انجام دیں گے۔ ہماری آرزو ہے کہ ایوب صاحب کے مقالات بصورت کتاب بھی شائع ہو جائیں

اور اس کے لئے ہم عنقریب اپنے فاضل دوست جناب ڈاکٹر سید معین الحق صاحب جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے تحریک کرنے والے ہیں۔
(العلم کراچی، جنوری ۱۹۵۷ء)

۵ جون ۱۹۵۷ء کو حضرت مولانا

سید مناظر احسن گیلانی کا وصال

ہوا۔ مولانا مرحوم کا دنیا سے علم و

ادب میں جو مقام رفیع تھا اور جیسے جیسے قیمتی کارنامے آپ نے انجام دئے

ان کا اقتضا تھا کہ "العلم" میں ان کے نمایان شان اظہار رنج و الم کیا جاتا

لیکن افسوس ہے کہ ہم سے اس خصوص میں کوتاہی ہوئی تا آنکہ ابھی حال

میں ہم کو مجاہد "الفرقان" لکھنؤ کا "افادات گیلانی نمبر" ہمدست ہوا۔

اس خوب اور بہت ہی خوب پرچے نے ہمیں اپنا بھولا ہوا فرض یاد دلایا۔

اور ہم یہ پڑا اثر مضمون جو ہمارے مخدوم و مکرم جناب مولانا سید ابوالحسن،

علی ندوی صاحب کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے شائع کرنے کی سعادت

حاصل کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ پر ہم خود اس

سے بہتر مضمون لکھ سکتے تھے۔ حالانکہ ہمیں مولانا سے دیرینہ نیاز مندی

کا ثمر حاصل تھا۔ مولانا صاحب سے راقم کو متعدد بار حیدرآباد دکن

میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور مراسلت بھی رہی علاوہ بریں ہمارے اور

ان کے درمیان بطور قدر مشترک مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شرفانی

کی ذات گرامی بھی تھی، جن کی پُر انوار صحبت میں جناب مولانا مناظر احسن گیلانی رح کا اکثر و بیشتر ذکر خیر رہتا تھا۔ مولانا کے سوانح نگار کو یہ چیز بھی نوٹ کرنی چاہیے کہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں ان کا تقرر مولانا اثر دانی مرحوم ہی نے اپنے زمانہ صدر الصدوری امور مذہبی میں کرایا تھا۔ اور اُن کا یہ حسن انتخاب دُنیا نے دیکھا کہ کامیاب سے کامیاب تر ثابت ہوا۔ اللہ سے دُعا ہے کہ مرحومین کو عقبیٰ میں مقام اعلیٰ نصیب ہو جس کے وہ بہ ہمہ وجوہ مستحق تھے۔

(العلم کراچی، جولائی ۱۹۵۶ء)

زیر نظر مقالہ پروفیسر جلیل الرحمن صاحب اعظمی **ابوالطیب متنبی** صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج کراچی کی کتاب

”ابوالطیب متنبی“ کا مقدمہ ہے، کتاب زیر طبع ہے، وہ دو حصوں پر منقسم ہے پہلے حصہ میں عرب کے مشہور شاعر ”متنبی“ کی پیدائش سے وفات تک کے حالات زندگی، شاعری کی ابتدا، اس کے مختلف ادوار، دعوائے نبوت، گرفتاری و رہائی، سیف الدولہ کی درباری شاعری اور جہلی، کافور کی بارگاہ میں باریابی، نظر بندی، فرار، ہجو، شاہ مشرقی عضو الدولہ کی مدح سرائی اور اس کے قتل کے مفصل حالات درج ہیں۔ دوسرے حصہ میں شاعری میں متنبی کا مرتبہ، خصوصیات شاعری، محاسن و معائب ردائع و فرائد، امثال و حکم وغیرہ پر تفصیل سے تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہم پروفیسر صاحب موصوف کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے کتاب

کے طبع ہونے سے پہلے ہی اس کا مقدمہ ہمارے رسالہ کو مرحمت فرمایا۔
(العلم کراچی، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی "ایڈیٹیو آف
مقدر انسانی" ایجوکیشنل ریسرچ کے زیر اہتمام معیاری کتابوں

کی تصنیف و تراجم کا جو مفید کام ہو رہا ہے اس سلسلہ کی ایک نہایت
اہم کتاب "ہیومن ڈسٹنی" (HUMAN DESTINY) مصنف ڈاکٹر
الی کامت۔ دو نوائے ہے جس کا "مقدر انسانی" کے نام سے اردو
ترجمہ ہمارے فاضل بزرگ جناب پروفیسر عبدالجمید قریشی صاحب کر رہے
ہیں۔ جناب قریشی صاحب نے اس کتاب اور اس کے مصنف کا العلم بابہ
جنوری ۱۹۵۷ء میں تفصیلی تعارف کرایا تھا اور جب سے ہم برابر موصوف
سے اصرار کر رہے تھے کہ اس کا ترجمہ کر دیں۔ چونکہ قریشی صاحب ایک
معیاری عالم ہیں اور ہر معیاری عالم لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں حد درجہ
کیا ب و محتاط ہوتا ہے اس لئے قریب ایک چوتھائی کتاب کا ترجمہ کرنے کے
بعد آپ نے یہ شرط لگائی کہ پہلے اس کا کچھ حصہ العلم میں شائع ہو جائے
اور جب اہل علم اس کو پاس کر دیں گے تو وہ کام کو جاری رکھ سکیں گے
قریشی صاحب جنہوں نے مدت العمر ہزاروں کو نیل، پاس کیا اب خود اپنا
امتحان لے رہے ہیں۔ اور یہ ان کی بہت بڑی عالی ظرفی ہے۔ ورنہ ظاہر
ہے کہ ان کی تحریر میں "جائے استاد خالی" ہونے کا سوال ہی کب
پیدا ہوتا ہے، محض "الافرق الادب" کی تعمیل کی جا رہی ہے۔ ہماری
طرح غالباً ناظرین العلم کو بھی قریشی صاحب کے معاملہ میں مشکل پیش آئیگی
کیونکہ اگر وہ عقیدتاً نیز حق و انصاف کی رو سے تعریفی خطوط لکھیں گے

تو قریشی صاحب ان سے بھی خفا ہو جائیں گے اور قریشی گے کہ "یہ سب ملی بھگت ہے" بہر حال کیا ہوگا اور کیا نہ ہوگا اس کی ابھی سے کیوں فکر کی جائے۔ ع

دل انگندیم بسم اللہ مگر یہاں دوسرا

(العلم کراچی، جنوری ۱۹۵۵ء)

زیر نظر مقالہ پروفیسر حبیب الرحمن صاحب اعظمی، صدر شعبہ عربی

متنبی کی زندگی کا ایک پہلو
اسلامیہ کالج کراچی کی کتاب ابوالطیب متنبی، کا ایک باب ہے جس کا مقدمہ اس سے پہلے العلم میں شائع ہو چکا ہے۔ کتاب گورنمنٹ پاکستان کے خاصہ صرفہ پر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کی طرف سے شائع ہو رہی ہے، کتاب میں سے یہ ایک چھوٹا سا باب بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ہمارے ناظرین کتاب کی افادیت کا کسی قدر اندازہ کر سکیں۔ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں متنبی کی سوانح عمری اور اس کے ادوار شاعری سے بحث ہے، دوسری جلد میں شاعری میں متنبی کا مرتبہ، اس کے امتیازات اور خصوصیات شاعری تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

(العلم کراچی، جولائی ۱۹۵۵ء)

مستر خلیق احمد نظامی استاد شعبہ تاریخ

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اپنی بلند پایہ اور

مقدمہ

۱۸۵۶ء کا تاریخی روزنامہ

محققانہ تالیفات کی وجہ سے باوجود کم عمری برصغیر پاک و ہند میں بہت عمدہ شہرت کے مالک ہیں "العلم" میں ان کے علمی کارناموں کا متعدد بار ذکر آچکا ہے۔ نظامی صاحب کی ایک تازہ تالیف "۱۸۵۶ء کا تاریخی روزنامہ" "ندوة المصنفین دہلی" نے شائع کی ہے۔ آخری مغلیہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے ہم عصر عبداللطیف کے اس روزنامہ پر خلیق صاحب نے ایک نہایت مبسوط "مقدمہ" شپور و قلم کیا ہے جو ہماری ناچیز رائے میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر اس وقت تک کے معلوم و موجود مواد کا نہ صرف بہترین خلاصہ ہے بلکہ پیش آمدہ واقعات کا ایک بصیرت افروز تجزیہ بھی ہے۔ اس مقدمہ کو جو ۱۸۵۷ء کے ۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ہم دو قسطوں میں شائع کر رہے ہیں تاکہ ناظرین "العلم" اندازہ کر سکیں کہ نظامی صاحب اور ندوة المصنفین دہلی نے کتنا اونچا کام کیا ہے اور یہ کہ اس کتاب کا مطالعہ کس قدر ضروری ہے۔ (العلم کراچی۔ جنوری ۱۹۶۰ء)

یادش بخیر! عزیز و محترم دوست جناب مشیر احمد علوی ناظر کا کوروی ایم اے، ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) کا انتہائی دلچسپ اور معلوماتی سلسلہ وار مضمون "کہکشاں سے قریں" جنوری ۱۹۶۰ء سے ناظرین "العلم" ملاحظہ فرما رہے ہیں جس کی اس دسمبر ۱۹۶۰ء تک تیسرہ قسطیں شائع ہو چکی ہیں۔ ناظر صاحب کے بقول انہوں نے اپنے مضمون کی صرف تین قسطیں ہمیں بھیجی ہیں اور چوتھی قسط ترسیل کے لئے تیار ہے موصولہ "تین قسطوں" میں سے ہم زیادہ سے زیادہ چھاپنے کی کوشش کے

باوجود اپنی "تیرہ قسطوں" میں ناظر صاحب کی صرف دو قسطیں چھاپ سکتے ہیں اور "تیسری قسط" سے اپنی چودھویں قسط شروع کر دینا ہی تھے کہ ہمیں ایک اور تازہ بتازہ مضمون ہمدست ہو گیا جو قلم اسکیپ سائز کے باریک قلم سے لکھے ہوئے انتیس صفحات پر مشتمل ہے جس میں سے ہم صرف سات صفحات فی الوقت چھاپ رہے ہیں۔ مضمون "کہکشاں سے قریں" بھی عمدہ اور "یادش بخیر" ابھی خوب ہی خوب جا رہا ہے اور مضامین کے باب میں ہماری مثال اس سچو کے کی سی ہے جس کے سامنے بیک وقت گرمی اور سردی اور لذت و مرغن متعین رکھ دیا جائے اور وہ اس لطیف الجہن میں مبتلا ہو جائے کہ کیا کھائے اور کیا نہ کھائے، یا پہلے کس کو کھائے اور بعد کو کسے؟ بہر حال اس الجہن کے سلجھاؤ کی یہی صورت سمجھ میں آئی کہ دونوں کو ملا کر نوش جان کیا جائے۔

دامان نگ تنگ و گل حسن تو بسیار

گلچیں نگاہ تو ز داماں گل دارد!

تو اب ہو ایہ کہ مضمون "یادش بخیر" بھی چھپے گا اور وہ پڑانا "کہکشاں سے قریں" ابھی۔ زیر نظر "یادش بخیر" میں اصل مضمون تو برائے نام ہے، خاصہ کی چیز ذیلی نوٹ ہیں۔ یوروپین مستشرقین کی تقلید میں گذشتہ چند سالوں سے برصغیر پاک و ہند کے مولفین و مصنفین میں کثرت و بہتات کے ساتھ تشریحی ذیلی نوٹ لکھنے کی عام ہوا چل پڑی ہے۔ کتاب یا مضمون کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہوتا ہوگا جسے ہی بھنسنے کے

”چھپک رو“ نہ بنایا جاتا ہو۔ اگر احیاناً کسی صفحہ میں کسی دوسرے کا حوالہ دینا ممکن نہیں ہوتا ہے تو اپنی کسی سابقہ تصنیف یا تحریر کو ہی سند میں پیش کر دیا جاتا ہے تاکہ راہواران افواج شاہان سلف کی طرح ان پر، ”بے داعی“ کا ”داع“ نہ لگنے پائے۔

اس بدعتِ حسد کے ارتکاب میں ہمارے ناظر کا کوئی صاحب بھی مبتلا ہو گئے۔ آخر کب تک بچے رہتے! پرائی مثل ہے ”روم میں لیا ہی کرو جیسا کہ روم والے کرتے ہیں“ انھوں نے سوچا کہ اس میدان میں بھی دوسروں سے پیچھے کیوں رہا جائے۔ بس پھر کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے، زیر نظر مضمون میں ایسی نوٹ بازی کی ہے کہ عزیز محمد الوبق قادری، مفتی انتظام اللہ شہابی اور ہادرم خلیق نظامی بھی مبہوت ہو جائیں گے۔ اور مولوی ذکاء اللہ مرحوم کی روح بھی اپنی اس کوتاہی پر تاشف کئے بغیر نہ رہے گی کہ ”تاریخ ہند“ کی (۷۱۶۹) صفحات پر مشتمل (۱۸) جلدوں میں ایک بھی حوالہ اور نوٹ نہ دیا درانحالیکہ تاریخی معلومات کا یہ دفتر بے پایاں سیکرٹوں قلمی و مطبوعہ کتابوں کی زیادہ تر حرف بحرف نقل پر مشتمل ہے، اگرچہ یہ ضرور ہے کہ جن کتابوں سے انھوں نے کام لیا تھا ان میں سے اکثر اب ناپید ہیں اور جس طرح آئندہ نسلیں مولوی رئیس احمد جعفری کی لاتعداد کتابوں سے استفادہ کریں گی اسی طرح آج ہم مولوی ذکاء اللہ مرحوم کی وافر نویسی سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

جناب ناظر کا کورومی صاحب کے حواشی میں ایک بات قابل تعریف ہے کہ وہ سب کے سب طبع زاد ہیں، انہوں نے سرقہ سے کام نہیں لیا ہے اس کے برخلاف عام طور پر ہمارے برعکس نہند نام زنگی کا فور بکثرت ”محققین“ یہ کرتے ہیں کہ دوسرے بڑے مصنفین کے انتہائی محنت سے جمع کئے ہوئے مواد اور اس کے حوالوں کو اپنی کتابوں میں کچھ ایسی چابکدستی سے شیر مادر کر لیتے ہیں گویا کہ وہ خود انہیں کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہیں اور بنیادی ماخذوں تک ان کی بڑا راست پہنچ ہو گئی تھی۔ رہا اصل مصنف یا مؤلف۔ اگر کسی نے گرفت کر لی تو زیادہ سے زیادہ اسے تو اردو کھسکا ٹال دیا جاتا ہے، ویسے بھی ایسے تیز رفتار زمانہ میں اس قسم کی گرفت کی نوبت کہاں آتی ہے۔ حضرت عبدالماجد دریا بادی۔ قاضی عبدالودود۔ مولانا غلام رسول مہرا اور ماہر القادری جیسے نقاد لاکھوں میں معدود کے چند ہوتے ہیں، سو ان کو اس طرح کی کتابیں بھیجنے کی ضرورت ہی کیا پڑی ہے۔

جناب ناظر کا کورومی کے مضمون میں سب سے زیادہ دل چسپ چیز یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے علیگڑھ کی پچاسیوں بھولی بسری شخصیتوں کی نہ صرف یاد تازہ ہو جاتی ہے بلکہ ان کی نگارشات کی بدولت علیگڑھ کے شب و روز کی جیتی جاگتی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ ناظر صاحب نے لکھنے کو تو مسٹر جیب احمد صدیقی کے مجموعہ کلام ”فکر و نظر“ کا ”مقدمہ“ لکھا ہے اور یہ پہلی قسط اس کی محض تمہید ہے لیکن جیسا کہ

ان کا طریقہ ہے تمہید ہی میں بات جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

کہ آگ لینے کو جائیں پمیری مل جائے

اسی کو کہتے ہیں ————— آخر آپ ان واعظوں کے عاشق صادق،

ہیں یا نہیں جو منبر پر کھڑے ہوتے ہیں تو پورے ایک گھنٹہ کی تمہید میں

تو گرما پاتے ہیں، اس کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع ہوتے ہیں،

لہذا اس حساب سے آج آپ کا واسطہ صرف تمہید سے ہے۔ اگلی قسط

میں آپ اصل بحث یعنی جیب صاحب کے حالات اور ان کے کلام

سے دو چار ہوں گے جس کی دلاویزی کی ہم پیشگی ضمانت دے سکتے ہیں۔

(العلم کراچی جنوری ۱۹۶۳ء)

العلم کی گزشتہ اشاعت

(جولائی تا ستمبر ۱۹۶۲ء)

مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ)

میں مولانا مرحوم پر میرے ناچیز مضمون کی پہلی قسط شائع ہوئی تو اس کو

بکثرت مقامی و بیرونی اصحاب نے پسند فرمایا۔ جن میں سے ایک محب محترم

جناب حمید حسن کاظمی بی، اے (علیگ) بھی تھے۔ آپ نے ازراہ ذرہ

نوازی دفتر میں خود تشریف لاکر بالمشافہ بہت کچھ مدد دی۔ لیکن میں

خالی خولی داؤ کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے کاظمی صاحب سے عرض کیا

کہ آپ بڑے ذی علم۔ مولانا مرحوم کے عزیز خاص اور ان کے خانہ دانی

حالات سے نہ صرف بخوبی واقف بلکہ ایک زمانہ میں کافی کام بھی کر چکے

ہیں لہذا ایک یا دو داشت یا مضمون لکھ کر عنایت کیجئے تاکہ جو باتیں مجھے

معلوم نہیں ہیں وہ آپ کی مہربانی سے ضبط تحریر میں آکر محفوظ ہو جائیں، شکر گزار ہوں کہ کاظمی صاحب نے میری ناچیز فرمائش کو قبول و منظور فرمایا اور ذیل کا مضمون (قسط دوم) آپ ہی کے رشتہاتِ قلم کا نتیجہ ہے قسط سوم کی فرمائش میں نے جناب الحاج مولوی حصلت حسین صاحب صابری سے کی ہے جو مولانا مرحوم کے پاکستان میں بڑی حد تک ہم شبیہ اور ان کے پُرانے فدائیوں میں سے ہیں، سنا ہے مولانا کے جیب بیب جناب سید اصغر علی شاہ صاحب (علیگ)، پینشنرز جج بھی جنہوں نے کراچی میں "طفیل میموریل اسکول" نام کی ایک درس گاہ کھولی ہے۔ مرحوم کے حالات پر اگر تحریک کی جائے تو اپنے تاثرات قلم بند فرما سکتے ہیں۔ رہا میرا اپنا سلسلہ مضمون تو وہ گھر کی کھیتی ہے ناظرین "العلم" "حدیث دیگران" سے فارغ ہو کر جب چاہیں گے اسے ملاحظہ فرمائیں گے

(العلم کراچی، اکتوبر ۱۹۶۲ء)

جناب پروفیسر عبدالمجید قریشی

صاحب جیسا کہ سب کو معلوم

علی گڑھ میں میرے ۳۳ سال

ہے علی گڑھ تحریک کی زندہ تاریخ ہیں اور خود ان کی ذات گرامی سے دارالعلوم کی بکثرت حسین و جمیل روایات وابستہ ہیں۔ ابھی حال میں، موصوف نے سرگودھا سے کراچی تشریف لا کر ۲۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو ۵ بجے شام آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ورکنگ کمیٹی کی صدارت فرمائی تو اس موقع پر آپ سے یہ بھی فرمائش کی گئی کہ اپنے ۳۳ سالہ

قیام علی گڑھ کی ایک آپ بیتی تحریر فرمادیں۔

قریشی صاحب کسی کام کے لئے آسانی سے راضی نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن جب ایک دفعہ وعدہ فرمائیں تو پھر موعودہ کام کو ضعیف العمری کے باوصف ایسی سرعت سے انجام دیتے ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہے۔ لہذا ذیل کا مقالہ موصوف نے دوسری گونا گوں مصروفیتوں کے باوجود ایک دن بیچ تیسرے روز یعنی ۱۳ مارچ کی دوپہر تک تیار کر دیا۔ اور پھر ہم نے بھی یہ کیا کہ اپنے مخدوم عالی جناب مرزا ممتاز حسن صاحب، قزلباش سابق چیف منسٹر ریاست خیرپور کے دولت کدہ پر ایک شاندار پنچ کا انتظام کرا کر بعد طعام اس لاجواب مقالہ کو زیر صدارت الحاج مولوی محمد عظمت اللہ صاحب دہلوی ایڈووکیٹ پڑھوایا۔ حاضرین نے فاضل مقالہ نگار کو خوب خوب داد دی اور یقین ہے کہ ناظرین "العلم" بھی اس سے نطف اندوز ہوں گے۔

قریشی صاحب سرگودھا واپس جا چکے ہیں اور اپنی آپ بیتی کی دوسری قسط تحریر فرما رہے ہیں جو انشاء اللہ کسی اگلے شمارہ میں شائع ہوگی

(العلم کراچی، اپریل ۱۹۶۳ء)

قیام پاکستان کے سلسلہ میں جب

پاکستان کا محفوظ خزانہ "بلوچستان"

ہندوستان تقسیم ہوا تو اغیار نے یہ خیال کر کے خوب خوشی منائی تھی کہ جس قدر زرخیز اور سرسبز و شاداب علاقہ تھا وہ ہندوستان

کے حصہ میں آیا اور جتنا ریگستانی ویران اور بنجر پہاڑی علاقہ تھا وہ پاکستان کو ملا ہے۔ جس کے نتیجے میں معاشی اعتبار سے پاکستان کبھی بھی خوشحال نہ رہ سکے گا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ گروشن زمانہ سے زر خیزی کی تعریف کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ سوئی گیس نے کوئلہ کی اہمیت کم کر دی۔ اسی طرح بے آب و گیاہ بنجر پہاڑوں اور ریگستان میں دوسری قیمتی معدنیات کی دریافت۔ نیز روئی ٹیٹن اور حسب ضرورت خوردنی اجناس اور انواع و اقسام کے پھلوں کی بڑھتی ہوئی پیداوار نے ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان کو رشک جنت بنا دیا ہے۔ صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے عہد صدارت میں غیر ترقی یافتہ علاقوں کو ترقی یافتہ بنانے کی انتھک کوشش کی جا رہی ہے۔ اس خصوص میں مغربی پاکستان کے گورنر ملک امیر محمد خاں (نواب کالا باغ) جو اپنی فہم و فراست متانت و سنجیدگی اور تعمیری کاموں میں گہری دل چسپی رکھنے کے معاملہ میں مشہور و معروف ہیں ملک کے پسماندہ علاقوں کی حالت سدھارنے پر بہت کچھ توجہ فرما رہے ہیں۔ سخت سے سخت موسم میں بلوچستان کے آٹے دن دور سے ان کے اسی جذبہ تعمیری کا ثبوت ہیں۔ بلوچستان کا وسیع و عریض علاقہ پاکستان کا ایک "مخفیہ خزانہ" ہے جس کو برآمد کرنے اور استحکام ملکی کے واسطے کام میں لانے کے لئے جناب حمید احمد کاظمی بی، اے (علیگ) کا تجویز بالا معلوماتی مقالہ ارباب حکومت اور اہل پاکستان کے لغز مطالعہ کا محتاج ہے۔

(العلم کراچی۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

”العلم“ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
 کا سہ ماہی آرگن ہے۔ اور ایک باوقار

علمی و تعلیمی ادارہ کے شایان شان جولائی ۱۹۵۷ء سے جاری ہے۔ اس
 میں نہ افسانے ہوتے ہیں نہ غزلیں اور نہ تجارتی اشتہار۔ جہاں تک اس
 کی پالیسی کا تعلق ہے۔ نہایت اچھوتی میانہ روی کے باعث گزشتہ
 چودہ سال کے عرصہ میں اس کے خلاف سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر کبھی
 کوئی اعتراض نہ ہوا۔

باعتبار عقائد، مسلمانوں میں جو دو مائتی ۷۲ فرقے ہیں ان پر مستزاد
 ہم چونکہ ایک تہترویں فرقہ ”علی گڑھ تحریک“ کے پیرو ہیں جس کی اصل
 روح :-

صلح مکمل اور

کسے رابا کسے کارے نباشد

ہے لہذا اس خصوص میں نہ تو کبھی ہم کسی پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور نہ کوئی
 دوسرا ہمارے اعمال و افکار کا نوٹس لیتا ہے۔

حکومت کے معاملہ میں عرض ہے کہ ہمہ وقت صرف ”کانفرنس
 اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ“ اور ”سرسٹیڈ گریس کالج“ کا مفاد
 ہمارے پیش نظر رہتا ہے۔ لہذا جو ارباب حکومت ان اداروں کے ہمدرد
 ہوتے ہیں وہ ہمارے مدد و اور جو ان سے اغماض بستے ہیں۔ ان
 سے ہم ”صرف“ بے نیاز رہتے ہیں۔ مخالفت کرنے کی نہ عادت ہے اور نہ

فرہست۔ ملی و ملکی فلاح و بہبود کا ایک مقدس مشن ہے جو یقین ہے کہ جتنا ہمیں عزیز ہے اتنا ہی مملکت کی انتظامیہ کو ہے۔



لیکن اس ہمہ جہت خیر سگالی کے باوصف سوء اتفاق سے ہم العلم کے سلسلہ میں ایک چکر میں پڑ گئے۔ جولائی تا ستمبر ۱۹۶۳ء کا پرچہ شائع کرنے کے بعد اس عالم میں کہ اگلے پرچہ کے قریب قریب تمام مضامین کی کتابت ہو کر ان کے پروف بھی آگئے تھے، مطبع نے اطلاع دی کہ ڈکلیئریشن کی تجدید کا حکم آیا ہے۔ ہوا یہ کہ اردو پریس آرڈی نینس ہم نے فروری ۱۹۶۱ء میں تجدید مذکور کے لئے درخواست دے دی تھی اور سی، آئی، ڈی کی تحقیقات اور رپورٹ کے بعد، جولائی ۱۹۶۲ء کے اخبار "ڈان" میں جن منظور شدہ اخبارات و رسائل کی فہرست شائع ہوئی تھی اس میں "العلم" بھی شامل تھا۔ جس پر ہم غلطی سے مطمئن ہو گئے، مگر اب بتایا گیا کہ ایک نیا ڈکلیئریشن فارم بھی اس وقت داخل کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ اس فرود گذاشت کا علم ہوتے ہی ہم نے ۱۵ ستمبر ۱۹۶۳ء کو معذرت خواہی کی درخواست پیش کر دی جو ڈی۔ ایم۔ آفس سے چل کر سی، آئی، ڈی، آفس۔ سینٹرل انٹیلیجنس بیورو۔ اور ڈائریکٹر صاحب انفارمیشن کے یہاں سے منزل منزل گزرتی ہوئی بالآخر فروری ۱۹۶۵ء کی کسی شروع تاریخ میں ڈی۔ ایم۔ آفس دوبارہ واپس آئی اور ہر چہ ہمارے محکموں کی قابل تعریف مہربانیوں کی بدولت ہمیں ۸ فروری ۱۹۶۵ء

کو "العلم" کا نیا ڈکلیئریشن حاصل ہو گیا۔



اس داستان سرائی کا مقصد ناظرین "العلم" کو اکتوبر ۱۹۶۲ء کا زیر نظر شمارہ اواخر فروری یا اوائل مارچ ۱۹۶۵ء میں ارسال کئے جانے کی وجوہ بتانا تھا۔ نیز یہ معذرت بھی کرنی تھی کہ جب سابقہ پرچہ میں اس قدر تاخیر ہو گئی ہے تو جنوری تا مارچ ۱۹۶۵ء کا حالیہ ایک پرچہ اشاعت پذیر نہ ہو سکے گا۔ ہمارے ناظرین آئندہ اپریل تا جون ۱۹۶۵ء کے شمارہ کا انتظار فرمائیں۔



لیکن یہ سطور سپرد قلم کرتے وقت ہمیں ایک اور عجیب تاثر ہوا، کہ ناظرین "العلم" سے کسی "معذرت" اور "دعوتِ انتظار" کی سرے سے کوئی ضرورت بھی ہے کہ نہیں! یوں تو ہر کلمہ میں استثناء ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر ہمارے خیال میں اس خالص علمی و تحقیقی مجلہ کی حیثیت ایک "ناخواندہ مہمان" کی سی ہے کیونکہ قریب چھ ماہ تک اس کی عدم حاضری کی کسی نے شکایت نہ کی۔ حتیٰ کہ پرچہ کے طلب و تقاضہ کا ایک کارڈ تک نہ آیا اور اس دل شکن کس پرسی کے احساس نے بعض اوقات ہمیں یہاں تک سوچنے پر مجبور کر دیا کہ جو متذکرہ بالا قانونی رکاوٹ پیش آگئی تھی اس کو دور کرانے کی مطلق کوشش نہ کریں اور اگر رسالہ بند ہو رہا ہے تو اسے بند ہی ہو جانے دیں۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ پرچہ ہماری ذاتی ملک

نہ تھا۔ ادارہ کا آرگن تھا، اور جب تک ادارہ کا وجود باوجود ہے اس کو بے زبان نہ ہونا چاہیے۔

دراصل ہمارے قارئین میں جو صاحب فضل و کمال ہیں ان کا علم اس قدر بڑھ گیا ہے کہ انھیں مزید معلومات کی ضرورت نہیں، اور جو عام قارئین ہیں سو وہ بیچارے اُسے بہتر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں مگر اپنے ڈھب کا نہیں پاتے! بہر حال! مثل سابق "العلم" چھپتا رہے گا اور کس بشنود یا نشنود من ہائے ہوئے می کنم پر ہم بدستور عامل رہیں گے۔



اس وقت ہمیں یہ بھی یاد آیا کہ جس قسم کے حالات سے ہم دوچار ہیں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم کو بھی ان ہی سامنا رہا، چنانچہ جب تک وہ "معارف" کے مدیر رہے قریب پچاس کروڑ آبادی کے برصغیر پاک و ہند اور پورے عالم اسلامی میں اس کی اشاعت ۱۶ سو سے زیادہ نہ تھی اور اس میں بھی کافی پرچے اعزازی جایا کرتے تھے۔ اسی طرح بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم اپنے سہ ماہی رسالہ "اردو" کو تمام دوسرے علمی پرچوں کی مقررہ تعداد اشاعت کے مطابق ایک ہزار چھپوایا کرتے تھے اور تھوڑے سے پرچوں کی تقسیم کے بعد بقیہ کو آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے انبار و در انبار گودام میں محفوظ کر دیا کرتے تھے۔ ہمارا (۱۳۸) صفحات کا یہ سہ ماہی "العلم" بھی جس پر فی پرچہ

دو روپے لاگت آتی ہے خیر سے ایک ہزار ہی چھپتا ہے اور معزز مستثنیات سے قطع نظر بڑی تعداد میں پندرہ پیسے کے مزید ٹکٹ لگا کر اُسے ملک اور بیرون ملک کے دانش کدوں اور دانشوروں کو روانہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس پر اچھی یا بُری رائے تو بڑی بات ہے رسید تک نہیں آتی اور نہ، ”مرسل الیہ“ کا پتہ تبدیل ہو جائے تو اُس کی کوئی اطلاع ملتی ہے۔ لہذا اب مجبوراً ہم نے یہ طے کیا ہے کہ اس مرتبہ پیمانے لوگوں کو پرچہ ارسال کرنے کے بعد آئندہ ہم صرف ان حضرات کی خدمت میں رسالہ روانہ کریں گے جو کم از کم ہمیں اپنی خیر و عافیت اور موجودہ پتہ سے مطلع فرمائیں گے۔

”ما بخیر شاماً بسلامت“ لہ (العلم کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۲ء)

انگریزی زبان کا مشہور شاعر ڈرامہ نویس اور ادیب آسکر وائلڈ ۱۸۵۶ء

”میرے جیل کے دو سال“

میں آئر لینڈ میں پیدا ہوا وہ نظریے ”ادب برائے ادب“ کا معتقد تھا۔ اس کا رہن سہن اور اخلاقی کردار بھی اس نظریہ سے کافی متاثر تھا۔ اس لئے آسکر کو نقادوں کی طعن و تشنیع کا ہدف بنا پڑا، ساتھ ہی نکل جدید لنڈ کے مصداق آسکر وائلڈ کی شہرت اور ادبی عظمت ایک نئی ادبی تحریک کے متنازعہ کی حیثیت سے روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ ۱۸۸۲ء میں اسکو ایک تقریری دورہ کے لئے امریکہ بھیجا گیا۔ اُس نے بہت سی

لہ افسوس ہے کہ اس تجویز پر طرفین کی جانب سے بالکل عمل نہ ہو سکا۔

وہ اپنی نحو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔
(بریلوی)

نظمیں، ڈرامے، افسانے اور ناول لکھے جن میں سے بعض انگریزی ادب میں شاہکار سمجھے جاتے ہیں، وائلڈ کا فراقی کردار اور سیرت معیاری نہیں تھی۔ لیکن اس کو جو ادبی عظمت حاصل ہوئی اس کی چمک دمک میں یہ خامیاں چھپ گئی تھیں۔ بدقسمتی سے ۱۸۹۵ء میں توہین کے ایک مقدمہ کے سلسلے میں عدالت کے روبرو اس کی اخلاقی کمزوریوں کے حیرت انگیز انکشافات ہوئے اور آسکر وائلڈ کو دو سال کی قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اس کا آخر زمانہ گناہی اور خمود میں بسر ہوا۔ وطن چھوڑ کر پیرس میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۸۹۸ء میں انتقال کیا۔ یہ مضمون اس کے زمانہ قید و بند کی ایک انتہا درجہ سبق آموز اور پراثر آپ بیتی ہے جس کو بشکرے "نقوش" لاہور نذر ناظرین کیا جا رہا ہے۔

(العلم کراچی، اکتوبر ۱۹۶۲ء)

بیلا شاہ - میرے ابا

بیلا شاہ کا اصلی نام ولایت حسین تھا۔ ۱۸۶۰-۶۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ اسی زمانہ میں بریلی میں ایسا سخت قحط پڑا کہ ان کی ماں نے اپنی اور اپنے بچہ کی زندگی قائم رکھنے کے لئے آنکھیں ہمارے محلہ کے جفت فروشوں کے ایک خوشحال گھر میں لاکر فروخت کر دیا۔ ان کے نئے گھر کے ہمنہ پورے ماں باپ نے ان کو انتہائی ناز و نعم سے پالا پوسا۔ لیکن جوان ہو کر وہ بڑی صحبت میں پڑ گئے اور ان کے ڈھنگ خراب ہو گئے۔ پھر کوئی ایسا چکر پڑا کہ آنکھیں تین سال کی جیل بھی ہو گئی۔ جیلخانہ میں جیسا کہ خود

میرے ایک جیلر دوست نے تصدیق کی سب قیدی مجرم نہیں ہوتے ہیں، بلکہ کم از کم پچیس فیصدی لوگ بے گناہ ہوتے ہیں اور حاکمانِ مجاز کی کسی دانستہ یا نادانستہ غلطی کے نتیجے میں قید و بند کے مصائب جھیلتے ہیں، ان میں بعض اہل اللہ اور صاحبانِ کشف و کرامت بھی ہوتے ہیں جن کے فیضِ صحبت سے بڑے بڑے عادی مجرموں کی قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی کسی بزرگ کی نظرِ کیمیا اثرِ ولایتِ حسین پر پڑ گئی اور وہ کچھ سی کچھ ہو گئے۔ لہذا جب وہ ایامِ اسیری پورے کر کے آزاد ہوئے تو اپنے گھر واپس نہیں گئے بلکہ ہمارے مکان کے قریب ایک غیر آباد شکتہ مکان کے کھیڑے میں چھوٹی سی جھونپڑی ڈال کر شب و روز یادِ الہی میں مصروف ہو گئے۔ ”خوردن برائے زیستن“ کا اللہ نے یہ سامان کر دیا کہ ہمارے قریبی رشتہ کے دادا جنہیں سب لوگ ننھے بھائی جان کہتے تھے اور جو اپنے قد کی درازی اور بلند آوازی کے لئے شہر میں معروف تھے ولایتِ حسین عرف بیلا شاہ کے یہ توفیق ایزدی کنیل ہو گئے۔ بے انتہا عسرتِ زندہ ہونے کے باوجود جو خود کھاتے دولوں وقت بیلا شاہ کو پہنچا آتے۔ رفتہ رفتہ بیلا شاہ بھی انھیں اپنا باپ اور ان کی بوڑھی بیوی ننی آپا کو اپنی ماں سمجھنے لگے۔ ساہا سال خالصتاً لوجہ اللہ بے لوث خدمت و محبت میں بیت گئے۔ تا آنکہ دادا نے بھائی جان کا انتقال ہو گیا اور ان کے اپنے تین متعلقین اور بیلا شاہ قطعاً بے سہارا رہ گئے، جب فاقوں پر فاقے ہونے لگے تو بیلا شاہ نے ایک دم اپنی زندگی کا

چولا بدل ڈالا اور بھجوائے

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

بسیح و سجادہ و دلق نیست

ایک لوہے کے کارخانہ میں گھن چلانے کی نوکری کر لی۔ دن بھر اس شدید ریاضت سے جو مزدوری ہاتھ آتی اسے شام کو چپ چاپ اپنی منہ بولی ماں کے قدموں میں لے جا کر رکھ دیتے۔ اس حال میں بھی کافی برس گزر گئے یہاں تک کہ سیٹھ کھنولال کی عمارت میں ایک پیرانی مسجد اور ہرے بھرے شاہ کا مزار برآمد ہوا جس کی خدمت و مجاوری کے فیرائض بیلا شاہ کو سپرد ہو گئے۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کی درج ذیل پڑاثر، داستان یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

(العلم کراچی، جولائی ۱۹۶۵ء)

۱۹۳۵ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے

باقیاتِ نواب و قار الملک مرحوم

نواب وقار الملک کی ایک مفصل و مبسوط سوانح عمری بصریہ ذریعہ کثیر، شائع کی تھی۔ مولوی محمد اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم اس کے مؤلف تھے اور نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی نے اس کی نگرانی فرمائی تھی۔ اس کے بعد مولوی محمد امین زبیری مرحوم نے ۱۹۳۵ء میں "تذکرہ وقار" کے نام سے نواب صاحب کی ایک لائف شائع کی۔ ایک چھوٹی سی کتاب "حیاتِ مشتاق" کے نام

سے بھی کسی زمانہ میں طبع ہوئی تھی۔ ان ہر سہ کتب میں برصغیر پاک و ہند کے اس بطلِ جلیل اور بانی آل انڈیا مسلم لیگ کے قریب قریب سب حالات سمٹ گئے ہیں، لیکن پھر بھی عرصہ سے یہ گمان تھا کہ نواب وقار الملک بہادر سے متعلق کافی مواد ان کے صاحبزادے جناب مشتاق احمد خاں بیسٹراٹ لاہ۔ مقیم حیدرآباد (دکن) کے پاس محفوظ و موجود ہوگا جس کو دست برد زمانہ سے بچا کر منقذ شہود پر آنا چاہیے چنانچہ وقتاً فوقتاً جناب مشتاق صاحب کو میں اس خصوص میں توجہ دلاتا رہا۔

خدا کا شکر ہے کہ صاحبزادہ صاحب موصوف جب سالِ گزشتہ کراچی تشریف لائے تو تمام مطلوبہ کاغذات اپنے ہمراہ لے آئے اور اب یہ قیمتی چیزیں مکان نمبر ۱۱۰ پیر الہی بخش کالونی کراچی میں انکی صاحبزادہ بتول مسرور احمد صاحبہ بی، اے۔ بی، ٹی کے پاس موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان چیزوں کو جلد از جلد نیشنل میوزیم آف پاکستان یا کوئی دوسرا بڑا کتب خانہ خرید کر اپنے پاس محفوظ کر لے۔ کاغذات مذکور کی تفصیل، درج ذیل ہے لے

(العلم کراچی۔ جولائی ۱۹۶۵ء)

۱۵ خدا کا شکر ہے کہ راقم کی تحریک اور جناب ممتاز حسن صاحب مینجنگ ڈائریکٹر نیشنل بینک آف پاکستان کی معارف پروردہ کی بدولت یہ نوادر نیشنل میوزیم نے دس ہزار روپے میں لاہور میں مسرور صاحبہ سے حاصل کر لئے (بریلوی)

مولانا سید محمد سورتی مرحوم | مولانا مرحوم اپنے آخری زمانے
حیات میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل

کانفرنس علی گڑھ کے کپاؤنڈ میں راقم کے تعمیر کرائے ہوئے مکانات میں
سے ایک مکان میں کرایہ پر رہتے تھے۔ ایک طرح کی کسپرسی کا عالم تھا۔
علامہ مبین عبدالعزیز صاحب نیز ان کے شاگرد علی گڑھ کی فضا پر چھائے
ہوئے تھے لہذا مولانا سورتی کو ابھرنے کا موقع نہ ملا۔ نتیجہ میں ان کو بھی
دنیا اور اہل دنیا سے بیزاری حد درجہ بڑھ گئی تھی۔ لوگ بشمول راقم ان
سے قرب حاصل کرتے ہوئے پس و پیش کرتے تھے۔ البتہ جب انتقال
ہوا تو جیسا کہ عام قاعدہ ہے ہر شخص کو بڑا ملال ہوا۔ تعزیتی جلسہ ہوا۔
ایصال ثواب کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

کاش ہم لوگ اپنے اہل کمال کے ظاہری حالات پر نہ جائیں اور جو
جس کا مقام ہو اس کے مطابق اس کی زندگی میں قدر و منزلت کر کے حق
السنائت ادا کریں۔ جناب پروفیسر محمد سرور صاحب نے بڑا اچھا کیا
کہ مولانا صاحب مرحوم کے حالات زندگی اور کمالات علمی کے متعلق یہ
نہایت معلوماتی مقالہ سپرد قلم فرمایا۔

(العلم کراچی جنوری ۱۹۶۶ء)

سر شاہ محمد سلیمان اور ادب اردو | کراچی کے مشہور تھپیوٹا فیکل
ہال میں ۱۸ مارچ ۱۹۶۶ء

کوہ بجے شام زیر صدارت آنریبل اے۔ آر۔ کارنیلیس چیف جسٹس پاکستان

”یوم سرشاہ سلیمان“ نہایت اہتمام سے منایا گیا۔ ہمارے بزرگ جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی اور جناب مولانا اسدالتقادی صاحب اس تقریب کے روح رواں تھے۔ صدر محترم نے اس موقع پر جو عالمانہ خطبہ صدارت ارشاد فرمایا (جس کی اخبارات میں اشاعت ہو چکی ہے) لاجواب تھا۔

سرشاہ مرحوم و مغفور علیگڑھ کی تعلیمی و اصلاحی تحریک کے اساتذین میں سے تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آپ وائس چانسلری کے فرائض بھی انتہائی خلوص، ایثار اور تندہی سے انجام دیتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ ہفتہ اور اتوار دو دن کے لئے ذاتی صرفہ سے فرسٹ کلاس میں الہ آباد سے علیگڑھ تشریف لاتے تھے۔ راحت و آرام کا جملہ سامان وائس چانسلر ہاؤس میں مہیا ہونے کے باوجود آپ دفتر سے لمحو ایک چھوٹے سے کمرہ میں قیام کرتے کھانے کے متعلق یہ معمول تھا کہ علیگڑھ پہنچنے سے پہلے طلباء کے ڈائیننگ ہال کے منظم کے نام تار آجاتا کہ تین چپاتیاں۔ دو شامی کباب

۱۔ صاحب تالیفات کثیرہ۔ ایڈیٹر انجمن اسلامیہ میگزین کراچی۔ صدر ادارہ تحقیق و تصنیف، سکریٹری انجمن ادارہ شریعیہ جنرل سکریٹری اردو اکیڈمی، سکریٹری جناح ریسرچ اکیڈمی، بانی دائرۃ المعارف قرآنیہ، صدر بن تمیما اکیڈمی، خازن دائرۃ معین المعارف، سکریٹری غلام حسین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بہاول پور، صدر انجمن اسلامیہ کراچی، نائب صدر و خازن جناح کالج وغیرہ وغیرہ۔

تورم اور ہاف پلیٹ فیرنی۔ یا شاہی ٹکڑوں کا انتظام کیا جائے، جن کا بل وہ باختر رسید فوراً ہی ادا کر دیتے تھے۔

قاعدہ قانون کی سختی کے ساتھ خود پابندی کرتے اور دوسروں سے بھی بلا رعایت تعمیل کراتے تھے۔ ویسے وہ حد درجہ منکسر المزاج خلیق اور جوہر شناس تھے، دوسروں کی کارکردگی و کارگزاری کا فراخ دلی کے ساتھ اعتراف فرماتے، چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۹ء میں میری ایک چھوٹی سی، کتاب "مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد" (THE STRUGGLE OF MUSLIMS IN EDUCATION) بزبان انگریزی شائع ہوئی تو اتفاقاً علیگڑھ ریلوے اسٹیشن پر ان سے اس طرح آشنا ہوا گیا کہ الہ آباد تشریف لے جانے کے لئے ریل کے ڈبہ میں سوار ہو رہے تھے۔ ایک پیر پلیٹ فارم پر اور ایک ریل کے ڈبہ میں رکھا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف پلٹ پڑے اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ فرمانے لگے "بھائی آپ نے خوب کتاب لکھی ہے! مجھے بہت پسند آئی" اس پر میں نے شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ اپنی قیمتی رائے لکھ کر مرحمت کر دیں تاکہ وہ میرے لئے ہمیشہ باعث افتخار رہے۔ فرمایا "ضرور! ضرور!" اور اس کے بعد دو تین روز ہی میں موعودہ "رائے" بذریعہ ڈاک مجھے پہنچ گئی۔

مشہور ماہر تعلیم، ادیب اور صحافی جناب مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی کا درج ذیل مضمون جس کو میں نے سہ ماہی "مصنف" علیگڑھ

بابت دسمبر ۱۹۳۳ء میں شائع کیا تھا اُسے اب دوبارہ بہ سلسلہ منعقد شدہ ”یوم سرشاہ سلیمان“ نذر ناظرین ”العلم“ کیا جا رہا ہے۔ نظامی صاحب سرشاہ محمد سلیمان مرحوم کے جیب لیب تھے اس لئے ان کے اس مضمون کی خاص اہمیت ہے۔

موصوف نے منجملہ اور باتوں کے مضمون میں ایک چیز یہ لکھی ہے کہ سرشاہ کو اردو نظم کی چھوٹی بڑی کتابیں خرید کر جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس میں ہمیں یہ مزید اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ مرحوم کو سب سے زیادہ کلام پاک کے قلمی و مطبوعہ نسخے ہر قیمت پر حاصل کرنے کا شغف تھا۔ حدیہ کہ جس کسی کو کچھ داموں کی ضرورت ہوتی وہ بازار سے نقد یا ادھار کلام پاک خرید کر ان کے پاس لے آتا۔ آپ اُسے چومتے آنکھوں سے لگاتے اور منہ مانگا ہدیہ پیش کر دیتے۔ بعض اوقات ایک ہی مطبع کے متعدد نسخے آجاتے مگر وہ کبھی نہ کہتے کہ یہ تو میرے پاس پہلے سے موجود ہے۔ چنانچہ جب آپ کالا جواب کتب خانہ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں بلا قیمت منتقل ہو کر ”سرشاہ سلیمان کلیکشن“ کے نام سے محفوظ ہوا تو اس میں سب سے زیادہ کلام اللہ کے نسخے تھے۔

نظامی صاحب نے زیر نظر مضمون میں یوپی پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۷ء بمقام بدایوں کا بھی ذکر کیا ہے جس کی سرشاہ محمد سلیمان صاحب نے صدارت فرمائی تھی۔

اسی کانفرنس کا ایک اور اجلاس آپ نے الہ آباد میں بھی مدعو کیا

جس کے وہ خود صدر استقبالیہ تھے۔ اس موقع پر یہ منظر قابل دید تھا کہ ہائی کورٹ کے جج ہونے کے باوجود ڈیروں خیموں کے لگوانے نیز دوسرے انتظامات میں عام رضا کاروں کی طرح محنت مشقت کے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ دھوپ میں کھڑے ہوئے کھونٹے گڑوار رہے ہیں، فرنیچر اٹھوا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ الغرض بہت ہی خوب انسان اور مسلمان تھے۔ ہمارے محترم سر شاہ محمد سلیمان مرحوم۔

اللہ تبارک تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے نام نیک کو ابد الابد تک قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

(العلم کراچی۔ اپریل ۱۹۶۶ء)



(۱۰) اردو زبان اور اسالیب :- تصنیف تیسرے محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی

9/-

مقدمہ از ممتاز حسن صاحب

(۱۱) حکیم عمر خیام :- تالیف ابوالکلام سلیم اللہ نعمی صاحب

2/50

مقدمہ از سید الطاف علی بریلوی

(۱۲) خط و خطاطی :- مصنفہ شیخ ممتاز علی جوہر پوری، محمد ایوب قادری ایم اے

1/25

مقدمہ از جناب ڈاکٹر زبیر احمد ایم اے پی، ایچ، ڈی

(۱۳) پاکستان کا معاشی پس منظر :- مصنفہ تیسرے انیس فاطمہ بریلوی پیش لفظ

3/50

از ڈاکٹر سید ظہیر الدین ایم اے، ڈی لٹ

(۱۴) ذکر و فکر :- مصنفہ تیسرے انیس فاطمہ بریلوی پیش لفظ از ڈاکٹر سید ظہیر الدین

3/50

ایم اے، پی، ایچ، ڈی

(۱۵) چند عظیم علمائے جبرائیم :- انگریزی تصنیف، ایگریٹ ہنٹرز کا اردو ترجمہ

4/-

از پروفیسر عبدالمجید قریشی

(۱۶) تعلیمی نفسیات کا بنیادی خاکہ :- از پروفیسر وحید الحق صدیقی سابق

4/-

پرنسپل ٹریننگ کالج علیگڑھ و تیسرے انیس احمد ایڈووکیٹ

(۱۷) علم و عمل (جلد اول) :- فارسی تصنیف وقائع عبدالقادر خانی کا اردو ترجمہ

8/-

از مولوی معین الدین افضل گڑھی ترتیب حواشی از محمد ایوب قادری بی اے

تعارف از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

(۱۸) علم و عمل (جلد دوم) فارسی تصنیف وقائع عبدالقادر خانی کا اردو ترجمہ

8/-

از مولوی معین الدین افضل گڑھی ترتیب حواشی از محمد ایوب قادری بی اے

تعارف از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

- (۱۹) مقدر انسانی :- بی کلام ڈونوائے کی تصنیف "ہیومن ڈسٹنی" کا اردو ترجمہ
 ۵/60 { از پروفیسر عبدالمجید قسیمی ایم، اے
- (۲۰) رومن رسم الخط اور پاکستان :- مصنفہ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی
 3/-
- (۲۱) قدیم شہنشاہیاں :- مصنفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ)
 3/-
- (۲۲) جان ڈوی کا فلسفہ تعلیم :- ڈاکٹر زور تھو اسپنس آرنٹ کی تالیف
 2/- { جان ڈویز فلاسفی آف ایجوکیشن کا اردو ترجمہ از سید عین الدین علوی ایم، اے
- (۲۳) اصول و اساس تعلیم :- سر پرسی نین کی عالماہ تصنیف "ایجوکیشن اس
 7/- { ڈیٹا اینڈ فرسٹ پرنسپلس" کا اردو ترجمہ از انعام عظیم برنی واخلاص حسین
 ایم، اے و محمد حسین خاں زبیری ایم، اے و سید بدر الحسن اوسید اظہر حسن
 رضوی ایم، اے۔
- (۲۴) اصول تدریس :- رابرٹن اور فوج کی کتاب پرنسپلس آف ٹیچنگ کا اردو
 5/- { ترجمہ از اخلاص حسین ایم، اے
- (۲۵) حیات ما بعد :- مصنفہ سید فاضلہ من حسین نقوی گویا جہاں آبادی
 3/50
- (۲۶) مکاشفات کشفی :- مصنفہ خان بہادر مرزا ابو جعفر کشفی
 3/-
- (۲۷) تجدد و امثال :- مصنفہ سید فاضلہ من حسین نقوی گویا جہاں آبادی
 2/-
- (۲۸) طالب علم کی ڈائری :- مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی، اے (علیگ)
 3/-
- (۲۹) مقاصد تعلیم :- اے۔ این۔ وہاٹ کی تصنیف ایس آف ایجوکیشن
 5/- { کا اردو ترجمہ از سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ جنگ، کراچی
- (۳۰) ارتقائے انسانی :- (جدید سائنس کی روشنی میں)
 2/- { مؤلفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ)

- (۴۵) عہد نگین کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ: تالیف مفتوحہ و لکھنؤ
- 12/- { فرخ آبادی۔ مترجم حکیم شریف الزماں اکبر آبادی حواشی و تعلیقات مسطر
محمد ایوب قادری ایم، اے
- (۴۶) تعلیمی مسائل: (پن نظر اور پیش منظر) مصنف
- 8/- { سید الطاف علی بریلوی بی، اے (علیگ)
- 10/- (۴۷) مشاہیر کے تعلیمی نظریے: انگریزی ترجمہ
- 8/- (۴۸) اقبال کا نظریہ تعلیم: از محمد احمد صدیقی ایم، اے (علیگ)
- 8/- (۴۹) ہند کے اسلامی عہد میں تعلیمی ترقی: تصنیف ڈاکٹر امین، امین لکھنؤ
- 8/- { ترجمہ اخلاص حسین زبیری ایم، اے و سلطان فاطمہ بلخی
- 4/- (۵۰) نواب خان بہادر شہید: مؤلف سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی
- 8/- (۵۱) تجزیہ کلام غالب: مصنف مولوی سید رفیع الدین بلخی مرحوم ایڈوکیٹ ٹنڈی
- 6/- (۵۲) ادب منزل منزل: تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی
- (۵۳) لائف آف حافظ رحمت خاں: انگریزی ترجمہ
- 20/- { از پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم، اے علیگ مؤلف سید الطاف علی بریلوی بی، اے
- 7/- (۵۴) تعلیم و تعلم: مرتبہ سید الطاف علی بریلوی بی، اے (علیگ)
- 4/- (۵۵) انشائیے: از فاضل احمد صدیقی ایم، اے مقدمہ از ڈاکٹر ابواللیث صالحی
- ذیر طبع
- (۵۶) ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن: جلد اول
- (۵۷) تاثرات و مشاہدات: سیدہ انیس فاطمہ مقدمہ انعام عظیم بریلوی ایم، اے
- (۵۸) مسلمانانِ کراچی کی تعلیم (۱۸۲۳ تا ۱۹۳۷) از سید مصطفیٰ علی بریلوی

تصانیف

سیدہ امین فاطمہ زہرا بیوی

- (۱) ادب منزل بمنزل؛ مقدمہ از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی 6/0
- (۲) پاکستان کا معاشی لہجہ منظر؛ مقدمہ ڈاکٹر سید محمد ظہیر الدین 3/50
- (۳) تاثرات و مشاہدات :- (زیر طبع)
- (۴) ذکر و فکر؛ مقدمہ از انعام عظیم برنی ایم، اے 175-
- (۵) یادیں اور خاکے :- (زیر طبع)
- (۶) ۱۸۵۷ء کے ہیرو :- (زیر طبع - بار سوم)

(شائع کردہ) —

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

سیدہ منزل متصل سید گریس کالج - ناظم آباد، کراچی ۱۸

تصانیف

سید الطاف علی بریلوی

- ۱۵/- حیاتِ حافظِ رحمتِ خاں :- (اردو طبع ثانی)
- ۲۵/- حیاتِ حافظِ رحمتِ خاں :- ترجمہ انگریزی مع تفصیلی تہبید
پروفیسر حامی الدین خاں
- ۳/- طالبِ علم کی ڈائری :- (طبع دوم) مقدمہ از ڈاکٹرِ عمرت حسین زبیری
- ۶/- راہی اور راہ نما :- سید الطاف علی بریلوی
- ۸/- تعلیمی مسائل :- (پہلے منظر اور پیش منظر)
پروفیسر محمد ایوب قادری
- ۶/- تعلیم و تعلم :- مقدمہ از مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی

— شائع کردہ —

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

سعیدہ منزل متعل سید گرس کالج، ناظم آباد، کراچی ۷۵

تراجم

پروفیسر محمد حامی الدین خان

رفقائے عظیم

تصنیف: میکس ایسٹ مین، قیمت 10/-

لائف آف حافظ رحمت خاں

(انگریزی ترجمہ) تالیف سید الطاف علی بریلوی قیمت 20/-

ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن

(زیر طبع و تصنیف)

(شائع کردہ)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

سعیدہ منزل متصل سید گریس، کالج ناظم آباد، کراچی ۱۹۵۰

مطبوعات کانفرنس اکیڈمی

سر سید علیہ الرحمۃ اور ان کے جانشینوں کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کی بنیادوں پر صالح کی تدوین و اشاعت پر رکھی گئی تھی۔ اس خصوص میں سب سے زیادہ کام ایجوکیشنل کانفرنس نے کیا۔ کانفرنس کی بنیاد ۱۸۸۶ء میں ڈالی گئی اور متحدہ ہندوستان میں اس کی ساٹھ سالہ ذریعہ خدمات سے اہل ملک بخوبی واقف ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۱ء میں اس ادارہ کا احیاء کراچی میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے کیا گیا جس نے قیام سر سید گزٹس کالج جیسی اہم خدمات کے علاوہ ایک "اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ" قائم کی ہے۔ جس کی طرف سے سہ ماہی رسالہ "العلم" اور بلند پایہ علمی و تعلیمی کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔ ان مطبوعات کی اہمیت و افادیت کے بارے میں اکابر ملت اہد برسراٹھ کی قدر افزا آرام اور ہمت افزا تبصرے موصول ہوئے ہیں۔ چونکہ فروخت کتب کی کل آمدنی تعلیمی مقاصد میں صرف کی جاتی ہے اس لئے ہمدرد قوم حضرات سے توقع ہے کہ وہ ان کی خریداری کر کے اپنی معارف پروری کا ثبوت دیں گے۔

سید الطاف علی بریلوی



لعالم

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا

سہ ماہی رسالہ
زیر اداوت

مشہور ماہر تعلیم اور مصنف ادیب موصی لومی سید الطاف علی صاحب بریلوی بی، اے (علیگ)
اس رسالہ میں مملکت پاکستان کی تعلیمی ترقی اور ثقافتی سرگرمیوں
کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے علمی اور تاریخی مضامین
و مقالات شائع ہوتے ہیں۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی علمی و ادبی جدوجہد کے
متعلق معلومات درج ہوتی ہیں۔ اور عوام کی واقفیت کو وسیع تر کرنے
کے لئے دل چسپ خبریں اور تبصرے ہوتے ہیں۔

چند سالانہ آٹھ روپے

کانفرنس کو کم از کم دس روپے سالانہ چندہ ممبری دینے والے

حضرات کی خدمت میں یہ رسالہ مفت پیش کیا جاتا ہے۔



مفتاح الایمان

(کتاب کے نام، پڑھو)

مفتاح الایمان
مفتاح الایمان